www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

August 2003 • No. 321

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز

الرسالہ، اگست 2003

سوئزرلینڈ کا سفر

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 1128
Fax: 2435 7333, 2435 7980
email: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $10/£6 (Air Mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
Al-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Ave,
Cooper City, FL 33328 U.S.A.
Tel. (954) 4358404, Fax: (954) 4342551
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published
by Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

سوئزرلینڈ کا سفر

یورپ کا ایک عالمی ادارہ ہے جس کا نام پیس انٹرنیشنل (Peace International) ہے۔ اُس کے تحت ایک اور ذیلی ادارہ قائم ہے جس کا نام نیوکلیر ڈس آرمامنٹ فورم (Nuclear Disarmament forum) ہے۔ اس ادارہ کا صدر دفتر سوئزرلینڈ میں ہے۔ اُس کی طرف سے مئی ۲۰۰۲ میں ہمارے دفتر کو انفارمیشن (Information) کے نام سے ایک اطلاعاتی کاغذ ملا۔ اس میں دوسری متعلق معلومات کے ساتھ یہ اطلاع درج تھی:

An International Conference in London took place in September 2001 where an outstanding Indian Peace-maker and leader of the Moslem community of India—Professor Maulana Wahiduddin Khan—put forword a proposal to establish a world wide movement for nuclear disarmament, encouraging Russia to make the first step. Nuclear Disarmament forum A G, accepted this proposal after Russia completed the first operation in history of utilization of the weapons-grade plutonium, a call which is set forth in both "The Bell of Zug" and in the decisions of the London conference.

پیس انٹرنیشنل (Nuclear Disarmament Forum) کی مذکورہ تحریر بتاتی ہے کہ ایٹم بم کے ذخیرے کو ختم کرنے کے سلسلہ میں راقم الحروف نے یک طرفہ اخلاقیات (unilateral ethics) کو اختیار کرنے کی تجویز پیش کی اور اس کے حق میں مضبوط دلائل دیئے۔ حکومت روس نے اس تجویز کو مان کر یک طرفہ طور پر اُس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اکتوبر ۲۰۰۲ تک ۲۷۰۰ نیوکلیر وار ہیڈ ختم کیے جا چکے تھے۔

راقم الحروف نے یہی تجویز پاکستان کے سامنے پیش کی۔ مطبوعہ تحریروں کے علاوہ اس سلسلہ میں میں نے ایک خط مورخہ ۹ جولائی ۲۰۰۱ پاکستان کے صدر پرویز مشرف کو روانہ کیا۔ مگر اہل پاکستان کو میری تجویز سمجھ میں نہ آسکی۔ وہ یک طرفہ اخلاقیات کے اصول کے تحت میری تجویز کو تو

قبول نہ کر سکے، مگر یک طرفہ تباہی کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے وہ ہندستان کے خلاف اپنی بے فائدہ نزاع کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد پیس انٹرنیشنل (Switzerland) کی طرف سے ہمیں ایک خط ملا جس پر ۱۸ جون ۲۰۰۲ کی تاریخ تھی۔ اس خط کے نیچے حسب ذیل پانچ افراد کے دستخط تھے:

اناٹلی کارپوو (Anatoly Karpov) پریزیڈنٹ آف دی بورڈ

آندرے بیکوف (Andrey Bykov) وائس پریزیڈنٹ آف دی بورڈ

البن براڈ بک (Alban Brodbeck) ممبر آف دی بورڈ

ڈاکٹر آٹوسی میر۔ بوس چنسیتن (Dr. Otto C. Meier-Boeschenstein) ممبر آف دی بورڈ

ہنس روڈالف وائلڈ (Hans-Rudolf Wild)۔

اس خط میں دوسری ضروری باتوں کے ساتھ یہ اطلاع درج تھی کہ پیس انٹرنیشنل اور نیوکلیر ڈس آرمامنٹ فورم نے متفقہ طور پر مجھے انٹرنیشنل پیس ایوارڈ کے لیے چنا ہے۔ اس ایوارڈ کی تقریب ۱۲/اکتوبر ۲۰۰۲ کو سوئزرلینڈ کے تاریخی شہر زُگ (Zug) میں منعقد ہوگی۔ اس خط کے الفاظ یہ تھے:

Most hounoured Maulana Wahiduddin Khan,

We have the honour to inform you that you have been nominated for the Award of the world wide movement for nuclear disarmament "Demiurgus Peace International" for the year 2002. The decision was adopted by the Board of Directors of Nuclear Disarmament Forum AG on a recommendation of "Demiurgus Peace International Council". The Award is presented to individuals as well as to public organisations for outstanding achievements in the field of strengthening peace among nations. We are deeply convinced that your unique personal contribution towards the cause of peace for many years fully justifies our choice.

اس دعوت نامہ کے مطابق، سوئزرلینڈ کا سفر ہوا۔ اس سفر میں بہت سے تجربات اور مشاہدات

سامنے آئے۔ اس سفر کی روداد مختصر طور پر یہاں درج کی جاتی ہے۔

سوئزرلینڈ کے لیے میرا یہ سفر پیس انٹرنیشنل کی دعوت پر ہوا۔ منتظمین نے میرے لیے اور میرے ساتھی کے لیے سوئس ایر میں دو سیٹ پیشگی ریزرو کردی تھی۔ مگر عملاً مجھے ٹکٹ کافی دیر سے، آخر وقت میں ملا۔ اس سلسلہ میں ہمارے آفس سے انٹرنیٹ کے ذریعہ کئی ای میل بھیجے گئے۔ ۱۴ اکتوبر کو دہلی میں سوئس ایر کے آفس میں اس کے بارے میں ٹیلی فون کیا گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمارے کمپیوٹر پر دو سیٹ ریزرو ہے۔ مگر اس کے لیے سوئزرلینڈ والوں کی طرف سے وہاں کے آفس میں ابھی ٹکٹ کی رقم جمع نہیں کرائی گئی ہے۔ پوچھا گیا کہ سوئزرلینڈ میں رقم جمع ہونے کے کتنی دیر کے بعد دہلی میں آپ ٹکٹ ایشو کردیں گے۔ جواب میں آواز آئی کہ بس دو منٹ میں۔

اس کے بعد ہمارے آفس کی طرف سے سوئزرلینڈ کے آفس کے نام ای میل سے پیغام بھیجا گیا۔ اُنہوں نے وہاں رقم جمع کردی۔ ۱۴ اکتوبر کو دوپہر میں یہ کارروائی ہوئی۔ اُسی دن تھوڑی دیر کے بعد دہلی میں سوئس ایر کے دفتر سے ٹیلی فون ملا کہ آپ کے دونوں ٹکٹ تیار ہیں۔ اس کے جلد ہی بعد دونوں ٹکٹ ہمیں مل چکے تھے۔ یہ جدید کمیونیکیشن کا کرشمہ ہے۔ دہلی اور سوئزرلینڈ کے درمیان آٹھ ہزار کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ مگر یہ پوری کارروائی بہت تھوڑے وقت میں اس طرح انجام پائی جیسے کہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں۔

سوئزرلینڈ کے لئے میرا پہلا سفر دسمبر ۱۹۸۶ میں ہوا۔ یہ سفر ورلڈ کونسل آن ریلیجس لبرٹی (The World Council on Religious Liberty) کی دعوت پر ہوا تھا۔ اس سفر کی روداد ماہنامہ الرسالہ فروری، مارچ ۱۹۸۷ میں دو قسطوں میں شائع ہوچکی ہے۔ مذکورہ کانفرنس کی کارروائی سوئزرلینڈ کے شہر جنیوا میں انجام پائی تھی۔

سوئیزرلینڈ کے لیے میرا دوسرا سفر جولائی ۲۰۰۱ میں ہوا۔ یہ سفر نیوکلیر ڈس آرمامنٹ فورم (Nuclear Disarmament Forum) کی دعوت پر ہوا تھا۔ اس سفر کی روداد ماہنامہ الرسالہ مارچ ۲۰۰۲ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ شائع ہوچکی ہے۔

سوئزرلینڈ کے لیے میرا تیسرا سفر موجودہ سفر تھا جو اکتوبر ۲۰۰۲ میں ہوا۔ یہ سفر دوبارہ نیوکلیر ڈس آرمامنٹ فورم کی دعوت پر ہوا جو پیس انٹرنیشنل کا ذیلی شعبہ ہے۔ اس کانفرنس کی کارروائیاں سوئزرلینڈ کے تاریخی شہر زُگ میں انجام پائیں۔

سوئزرلینڈ یورپ کا ایک درمیانی ملک ہے۔ اس کے پاس سمندری ساحل نہیں۔ یعنی وہ ایک لاگڈ (Logged) کنٹری ہے۔ موجودہ کمیونی کیشن کے زمانہ میں کسی ملک کا سمندری ساحل سے محروم ہونا ایک بہت بڑی کمی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کمی کے باوجود سوئزرلینڈ ایک ترقی یافتہ ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔

عراق صرف جزئی طور پر سمندری ساحل سے محروم ہے۔ یعنی اس کا ساحل بہت چھوٹا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے عراق نے اپنے تمام وسائل کو استعمال کر کے زبردست فوج بنائی اور اپنے پڑوسی ملک کویت پر حملہ کر دیا تاکہ اس کے ساحلی حصہ پر قبضہ کر کے اپنی سمندری کمی کی تلافی کرے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ سوئزرلینڈ برابر ترقی کر رہا ہے مگر عراق اتنا زیادہ تباہ ہو گیا کہ شاید سو سال میں بھی اس کے نقصان کی تلافی ممکن نہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان اس فرق کا سبب پرتشدد طریقِ کار اور پرامن طریقِ کار کے فرق میں چھپا ہوا ہے۔ سوئزرلینڈ نے اپنی سمندری محرومی کی تلافی اس طرح کی کہ اس نے اپنی کوئی طاقتور فوج نہیں بنائی تاکہ اس کا کوئی پڑوسی اس سے خوفزدہ نہ ہو۔ اس نے اپنے پڑوسی ملکوں سے یکطرفہ طور پر اچھے تعلقات کیے۔ اس نے ضرر رسانی کے بجائے نفع رسانی کو اپنا طریقِ کار بنایا۔ جب کہ عراق نے اس کے بالکل برعکس طریق کار کو اپنایا۔ نتیجہ بتاتا ہے کہ دونوں میں سے کون سا طریقہ زیادہ مفید ہے۔

سوئزرلینڈ کے اس سفر میں ایک ہندستانی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی کام کے تحت یورپ جا رہے تھے۔ میرے ساتھی نے اُن کو بتایا کہ سوئزرلینڈ کے ایک عالمی ادارہ پیس انٹرنیشنل (Demiurgus Peace International) کی طرف سے مجھے ایک پرسٹیجس پیس ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ یہ سُن کر اُنہوں نے کہا:

ہندستان کے مسلمان تو تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ پھر اس قسم کے ایوارڈ پر خوشی کیا۔

ہندستانی مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں یہ منفی سوچ کوئی انفرادی نہیں، وہ ہندستان کے تمام مسلمانوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے افراد اسی قسم کی باتیں لکھ رہے ہیں اور بول رہے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہندستان کے تمام مسلمانوں کے مزاج کو شکایتی مزاج بنا دیا ہے۔

اس کے بعد سوال و جواب کے دوران مذکورہ ہندستانی مسلمان نے بتایا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے اُس کے خاندان کی معاشی حالت بالکل معمولی تھی۔ آج وہ ایک اکسپورٹ بزنس کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج وہ معاشی اعتبار سے سوگنا زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ یہی حالت ہندستان کے بیشتر مسلمانوں کی ہے۔ موجودہ ہندستان میں جو مسلمان بھی کسی کام میں مصروف ہے، اُس سے پوچھئے کہ ۱۹۴۷ میں اُس کے خاندان کی اقتصادی حیثیت کیا تھی اور آج کیا ہے، تو معلوم ہوگا کہ اس مدت میں تقریباً ہر مسلم فرد اور ہر مسلم ادارہ نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے پاکستانی لیڈروں نے کہا تھا کہ ہم ہندستانی مسلمانوں کو قربان کر کے پاکستان بنائیں گے۔ کٹر ہندو یہ سمجھتے تھے کہ آزادی کے بعد یہاں کے مسلمانوں کا وہی انجام ہوگا جو اس سے پہلے اندلس میں ہوا۔ آزادی کے بعد ہندستان کے تمام مسلم رہنما اور مسلم دانشور اپنے پچھلے ذہن کے تحت یہ خبر دیتے رہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی جارہی ہیں، وہ سخت متعصّبانہ سلوک کا شکار ہیں۔ اُنہیں ظلم کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ گویا ''مسلم میڈیا'' کے مطابق، ہندستان کو دوسرا اسپین بنانے کا عمل برابر جاری رہا۔ مگر ان سب کے باوجود ہندستان کے مسلمان ہر اعتبار سے غیر معمولی ترقی کا سفر کرتے رہے۔

دہلی کے مسلمانوں کی آج کی حالت کا تقابل اُن کی ۱۹۴۷ کی حالت سے کیجئے۔ حیدرآباد کے آج کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا تقابل اُن کی اس حالت سے کیجئے جو نظام اسٹیٹ کے زمانہ میں اُن کی تھی۔ اسی طرح دوسرے شہروں اور قصبوں کے مسلمانوں کی حالت کا تقابل اس

انداز سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ کے مسلمانوں نے اس مدت میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب: ہندستانی مسلمان)

آزادی کے بعد ۵۵ سال کی مدت میں یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس واقعہ پر ریسرچ کر کے اُس سے سبق حاصل کیا جائے، مگر ایسا نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندستان کے موجودہ مسلمان شکایت کی نفسیات میں جی رہے ہیں اور جو لوگ شکایت کی نفسیات میں جئیں وہ مثبت حقیقتوں کو جاننے کے لیے اُسی طرح نااہل ہوجاتے ہیں جس طرح روایتی ساس اپنی شکایتی نفسیات کی بنا پر اپنی بہو کی خوبیوں سے بے خبر رہتی ہے اور اسی طرح روایتی بہو اپنی شکایتی نفسیات کی بنا پر ساس کی خوبیوں کو دریافت نہیں کر پاتی۔

اللہ کے فضل سے میرے اندر شکایتی مزاج نہیں۔ اپنے اس غیر شکایتی مزاج کی بنا پر میں نے اس معاملہ کی غیر جانب دارانہ تحقیق کی۔ اس تحقیق کے بعد مجھ پر ایک عظیم حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ یہ فرق دور میں فرق کی بنا پر ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان زرعی دور میں تھا۔ اُس وقت وسائل معاش بہت کم تھے۔ لوگ صرف محدود دائرہ میں اپنی کوشش کر سکتے تھے۔ مگر آزادی کے بعد ہندستان میں تیزی سے صنعتی دور آیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کو اقتصادی انفجار (economic explosion) کہا جاتا ہے۔ اس انقلاب نے اقتصادی ترقی کے مواقع لامحدود حد تک بڑھا دیئے۔ ان نئے حالات کی بنا پر کسی کے لیے یہ ممکن ہی نہ رہا کہ وہ کسی دوسرے کی ترقی کو روک سکے۔

یہ انقلاب بلاشبہہ قرآن کے الفاظ میں: ویرزقه من حیث لا یحتسب (الطلاق ۳) کا معاملہ تھا۔ یہ اس قابل تھا کہ سارے مسلمان شکر کے جذبہ سے سرشار ہو جائیں۔ مگر اُن کی شکایتی نفسیات نے اُنہیں اس عظیم دریافت سے محروم کر دیا اور اسی طرح عظیم شکر گذاری سے بھی۔

اسی قسم کا ایک تجربہ سوئزرلینڈ میں بھی پیش آیا۔ وہاں اتفاقی طور پر ایک عرب مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ تعلیم یافتہ تھے مگر وہ مجھے مایوسی کا شکار نظر آئے۔ اُنہوں نے موجودہ مسلم دنیا کی تاریک تصویر پیش کی۔ اُنہوں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں مجھے ایک انگریزی کتاب

ملی جس میں بتایا گیا تھا کہ ہندستان کے مسلمان ایک محروم گروپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں کی جمہوریت میں وہ غیر موثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ چنانچہ کتاب کا نام تھا، منفعل آوازیں:

Passive Vioces

میں نے کہا کہ یہ کتاب میں نے دیکھی ہے۔ مگر وہ ہندستانی مسلمانوں کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتی۔ آپ کو اگر ہندستانی مسلمانوں سے دلچسپی ہے تو آپ سفر کر کے ہندستان جائیں اور وہاں کے مسلمانوں کا سروے کریں۔ آپ ہندستانی مسلمانوں سے صرف ایک سوال کریں: ۱۹۴۷ میں تمہارے خاندان کی معاشی حالت کیا تھی اور آج تمہاری معاشی حالت کیا ہے۔ آپ حیرت انگیز طور پر پائیں گے کہ ہندستان کا تقریباً ہر مسلمان یہ بتائے گا کہ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج اس کی مالی حالت بہت زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح آپ ہندستان کی مسجدوں، وہاں کے مدرسوں اور وہاں کے مسلم اداروں کا جائزہ لیں اور یہ معلوم کریں کہ ۱۹۴۷ میں مادی اعتبار سے اُن کی حالت کیا تھی اور آج اُن کی حالت کیا ہے۔ آپ حیرت انگیز طور پر دیکھیں گے کہ وہاں کی ہر مسجد اور ہر مدرسہ اور ہر ادارہ بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ غیر مسلم قوموں کی نفرت میں جیتے ہیں۔ اس بنا پر آپ لوگ بغضك الشئ يعمى و يصم کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ایک حقیقت جو سورج کی طرح نمایاں ہے مگر وہ اسی کمزوری کی بنا پر آپ جیسے لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی۔ حتیٰ کہ اس کمزوری کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ آپ زمانہ کی ایک تبدیلی سے بالکل بے خبر رہے۔

میں نے کہا کہ قدیم زمانہ اقتصادی اعتبار سے زراعت کا زمانہ تھا اور سیاسی اعتبار سے بادشاہت کا زمانہ۔ اس کے نتیجہ میں قدیم زمانہ کچھ لوگوں کی اجارہ داری (monopoly) کا زمانہ بنا ہوا تھا۔ اقتصادیات میں اُن لوگوں کی اجارہ داری تھی جن کے قبضہ میں زرعی زمین ہو۔ اور سیاست میں اُن لوگوں کی اجارہ داری تھی جن کے قبضہ میں بادشاہت کا تخت ہو۔ جدید انقلاب میں یہ دونوں اجارہ داریاں ٹوٹ گئیں۔ جدید صنعتی انقلاب نے اقتصادی ذرائع کو اصحاب زمین (land lords) کے

قبضہ سے نکال کر اُن کو آخری حد تک عمومی بنا دیا۔ اس طرح جمہوری آزادی کے فکری انقلاب نے سیاسی اقتدار کو شاہی خاندان کے محدود دائرہ سے نکال کر سارے عوام کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس جدید اقتصادی انقلاب کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی قوم محرومی کا شکار ہو۔ محرومی کے واقعات زرعی دور کا نتیجہ تھے۔ جدید اقتصادی دور میں اس قسم کی محرومی ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں نے ۱۹۴۷ کے بعد بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ مگر ہمارے مسلم رہنما ۱۹۴۷ کے پہلے والے زرعی نقشہ میں سوچتے ہیں۔ وہ جدید اقتصادی نقشہ میں سوچنے والے نہ بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی بولی جدید حالات کے مطابق نہیں۔

ریزرویشن کے مطابق، دہلی سے روانگی کی تاریخ ۱۰ اکتوبر کی شام کو تھی۔ میں ایک قافلہ کی صورت میں روانہ ہوا۔ اس میں میرے سوا مزید ۱۵ افراد شامل تھے — ڈاکٹر ثانی اثنین خاں، محمد خالد انصاری، رجت ملہوترا، پریا ملک، ڈاکٹر فریدہ خانم۔ ائرپورٹ پر ہم لوگ رات کو ۱۱ بجے پہنچے۔ جہاز کی روانگی رات کو ایک بجے تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پرواز کے وقت کلنڈر بدل چکا تھا۔ شمسی کلنڈر میں رات کے بارہ بجے کے بعد اگلا دن شروع ہو جاتا ہے۔ مگر قمری کلنڈر میں غروب آفتاب بالفاظ دیگر طلوع قمر سے نیا دن شروع ہوتا ہے۔

دہلی سے سوئس ایر کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ دہلی سے زیورک تک کے سفر کے لئے ایک ڈائرکٹ فلائٹ ہے جو ساڑھے آٹھ گھنٹہ میں پہنچتی ہے۔ دوران پرواز مختلف اخبارات اور پرچے دیکھے: ائر کمپنی کا اِن فلائٹ میگزین سوئس میگزین (Swiss Magazine) کا شمارہ اکتوبر ۲۰۰۲ دیکھا۔

اس کے تمام مضامین بیک وقت دو زبانوں میں تھے۔ جرمن اور انگریزی۔ ایک مضمون میں سوئزرلینڈ کے نقشہ کے ساتھ ملک کے بارے میں مختلف قسم کی معلومات دی گئی تھیں۔ مثلاً اس میں بتایا گیا تھا کہ جاپان کے بعد پبلک ٹرانسپورٹ کا سب سے زیادہ وسیع نظام سوئزرلینڈ میں ہے۔ دنیا کی سب سے زیادہ طویل کیبل ریلوے کا نظام سوئزرلینڈ میں ہے، وغیرہ۔

لندن کے انگریزی روزنامہ ٹائمس (The Times) کا شمارہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ دیکھا۔ اس کے صفحہ اول پر عراق کے صدر صدام حسین کی ایک بہت بڑی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس اسٹیچو کے سامنے ایک کاریگر کھڑا ہوا اس پر کچھ کام کر رہا ہے۔ عظیم اسٹیچو کے سامنے وہ آدمی بونا نظر آتا ہے۔ یہ بغداد میں نسب کئے جانے والے ۹ نئے مجسموں میں سے ایک تھا:

An assistant works on one of the nine new statues of Saddam Husain being made at the Baghdad fine art Academy.

دہلی سے زیورک تک کی پرواز میں گہری نیند آ گئی۔ اس طرح یہ راستہ آسانی کے ساتھ طے ہوگیا۔ نیند ایک عجیب نعمت ہے۔ اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ اگر چہ ماہرین ابھی تک یہ دریافت نہ کر سکے کہ انسان کو نیند کیوں آتی ہے۔ نیند کے بارے میں نپولین بوناپارٹ (وفات ۱۸۲۱) نے کہا تھا کہ کیا ہی خوش کن چیز ہے نیند۔ بستر میرے لیے ایک ایسی راحت کی چیز ہے جس کے بدلے میں دنیا بھر کے تخت کو لینا بھی پسند نہ کروں گا:

What a delightful thing rest is—The bed has become a place of luxury to me. I would not exchange it for all the thrones in the world.

دہلی سے زیورک تک کی پوری پرواز نہایت ہموار تھی۔ زیورک ائیر پورٹ پر لینڈنگ بھی اس طرح ہوئی کہ مسافروں کو اس کا پورا اندازہ بھی نہ ہوسکا۔ جہاز فضا میں ٹیک آف (take off) کرتا ہے اور اڑتے ہوئے ۸ کیلومیٹر اور ۱۰ کیلومیٹر کی اونچائی تک پہنچ جاتا ہے اور پھر آہستگی کے ساتھ نیچے آ کر وہ زمین پر اتر جاتا ہے۔ اس قسم کی باتوں کو لوگ ٹکنالوجی کا کارنامہ سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ وآتاکم من کل ما سألتموہ (ابراہیم ۳۴) کا کرشمہ ہے۔

زیورک ایر پورٹ پر کانفرنس کے افراد مل گئے۔ یہاں سے بذریعہ کار زُگ کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ تقریباً ایک گھنٹہ کا راستہ تھا۔ پورا راستہ ایک گل زار ماحول میں طے ہوا۔ ایک طرف مسلسل سر سبز پہاڑیاں نظر آتی تھیں اور دوسری طرف سلیقہ کے ساتھ بنی ہوئی بلڈنگوں کی قطاریں۔ روڈ نہایت ہموار تھی۔ کبھی کسی گاڑی نے اوورٹیک (overtake) نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر گاڑی اسی طرح اپنی لین (lane) میں چل رہی ہے جس طرح ستارے اپنے مدار میں چلتے ہیں۔ ڈرائیور ملک کے حالات کے بارے میں ہر بات اس طرح بتاتا جاتا تھا جیسے کہ وہ صرف ڈرائیور نہ ہو بلکہ اسی کے ساتھ وہ گائیڈ (driver cum guide) ہو۔

سوئزرلینڈ چونکہ ایک سیاحتی ملک ہے۔ اسی لئے غالباً یہاں کار چلانے والے کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مسافروں کو دوران سفر بھرپور معلومات دیتا رہے۔

اس طرح چلتے ہوئے ہم زُگ شہر کے پارک ہوٹل میں پہنچے۔ یہاں کے سوئٹ نمبر ۴۰۱ میں میرے قیام کا انتظام تھا۔ یہاں ہر طرح کی سہولتیں مہیا تھیں۔ میری سوئٹ کے باہر دور تک فطرت کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ بظاہر یہ مقام بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ہم لوگوں کو مستقل طور پر یہاں رہنا ہو تو یہ ہمارے لئے کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ اس قسم کی پر راحت زندگی کی یہ لازمی قیمت دینی پڑے گی کہ ہمارے ذہن میں تھنکنگ پراسس رک جائے۔ ہم اعلیٰ انسانیت سے تنزل کر کے بس ایک قسم کے بے فکر حیوان بن کر رہ جائیں گے۔

زُگ (Zug) سوئزرلینڈ کا ایک تاریخی شہر ہے۔ زُگ کے دو حصے ہیں — قدیم شہر اور جدید شہر۔ زُگ یہاں کی ایک جھیل کا نام ہے۔ یہ شہر اس جھیل کے کنارے واقع ہے۔ اسی نسبت سے اُس کا نام زُگ پڑ گیا۔ زُگ کا سب سے پہلا تاریخی حوالہ ۱۲۴۲ء میں ملتا ہے۔ یہ علاقہ شاہ روڈولف (Rudolf IV of Habsburg) نے ۱۲۷۳ میں خریدا تھا۔ وہ ۱۳۵۲ میں سوئس کنفیڈریشن (Swiss Confederation) میں شامل ہوا۔ ریفارمیشن تحریک کے زمانہ میں وہ رومن کیتھولک بنا رہا۔ یہاں بہت سی تاریخی عمارتیں پائی جاتی ہیں۔

ہمارے سوئٹ (401) کے اندر ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ اس میں عام موضوعات پر کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم نے اپنے یہاں کی کچھ انگریزی کتابیں بھی اس کے اندر رکھ دیں۔ ان کتابوں میں ایک انٹرنیشنل میگزین تھا جس کا نام یہ تھا:

The Pearls of Switzerland

۲۸۸ صفحات کے اس میگزین میں ایک مضمون اس عنوان کا تھا:

Education—investing in the future.

اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ زمانہ میں دنیا کی اقتصادیات تیزی سے عالمی بنتی جا رہی ہے اور مارکیٹ باہمی طور پر جڑ گئی ہیں۔ سوئزرلینڈ جیسی چھوٹی اور کھلی اقتصادی مارکیٹ کے لیے گلوبلائزیشن اور مارکیٹ کا آپس میں مربوط ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ کمپنیاں مستقل طور پر مسابقت

کی حالت میں رہیں۔ اس قسم کی مارکیٹ میں وہی کمپنیاں زندہ رہ سکتی ہیں اور مارکیٹ کے شئرس حاصل کرسکتی ہیں جب کہ وہ مستقل طور پر نئے اور اوریجنل سامان تیار کریں اور خریداروں کی ضرورت کے مطابق سروس دے سکیں۔ ریسرچ اور ترقی، علم اور فنی معلومات، ایجادات اور ٹکنکل ترقیاں ترقی کے لئے لازمی اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔

> The world economy is becoming increasingly global, and markets are virtually integrated. For a small and open economy such as Switzerland's —which is itself a place for doing business— globalisation and the integration of markets mean that companies are in permanent competition with others. In such a market place, companies can only survive and gain market shares if they constantly come up with new and original products and services which respond to the needs of customers. Research and development, the generation of knowledge and know—how, innovation and technological progress are crucial to this process (33)

ہماری دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو چیلنج کا مقابلہ تحفظ کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دانش مندی یہ ہے کہ چیلنج کا مقابلہ جوابی تیاری کے ذریعہ کیا جائے۔ جوابی تیاری اگر زندگی ہے تو تحفظ مقابلہ کی اس دنیا میں صرف موت۔

۱۱ اکتوبر کا دن زیادہ تر ملاقاتوں میں گزرا۔ کانفرنس میں مختلف ملکوں کے لوگ کئی سو کی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ ان سے گفتگو اور تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ یورپ کے ایک مسیحی پروفیسر نے گفتگو کے دوران اسلامی جہاد کے بارہ میں سوال کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ جہاد (متشددانہ طریقِ کار) کی اہمیت قدیم زمانہ کے لحاظ سے تھی۔ موجودہ زمانہ میں اس کی مناسبت (relevance) ختم ہوچکی ہے۔ آپ لوگوں کو چاہئے کہ اسلام میں ریفارمیشن جیسی تحریک چلائیں اور اسلام کی قدیم تعلیمات میں نظر ثانی کرکے اُس کو وقت کے مطابق بنائیں۔

میں نے کہا کہ اسلام میں ریفارمیشن (اصلاح) کی ضرورت نہیں بلکہ احیاء (revival) کی

ضرورت ہے۔ جہاد اصلاً پُر امن جدوجہد (الفرقان ۵۲) کا نام ہے۔ بعد کے کچھ سیاست پسند مسلمانوں نے جہاد کو مسلّح عمل کے ہم معنی بنا دیا۔ اب ضرورت یہ ہے کہ جہاد کو اُس کے اصل تصور کی حیثیت سے زندہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ آپ کو چاہئے کہ آپ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان فرق کریں۔ مسلمانوں کے قول یا عمل کو دیکھ کر اسلام کے بارے میں رائے قائم نہ کریں بلکہ مسلمانوں کے عمل کو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں جانچیں۔

۱۱ اکتوبر کی شام کا ڈنر لوسرن (Luzern) کے ہوٹل شووے زرہاف (Shweizerhof) میں تھا۔ زُگ سے بذریعہ کار ہم لوگوں کو لوسرن لے جایا گیا۔ وہاں ایک بڑے ہال میں لوگوں کو ڈنر دیا گیا۔ ڈنر سے پہلے موجودہ کانفرنس کے ناظم اعلیٰ مسٹر آندرے بیکوف نے تقریر کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں مختلف ملکوں سے آنے والے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ میرا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان جو ٹنشن کم ہو گیا ہے وہ مولانا کی پر امن کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اس ڈنر کی تقریب کے خصوصی مہمان روس کے سابق صدر میخائیل گورباچوف تھے۔ وسیع ہال میں مختلف میزوں کے گرد تمام مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے جس میز پر بیٹھایا گیا وہاں گورباچوف بھی بیٹھے تھے۔ میری کرسی گورباچوف کے دائیں طرف تھی اور ترجمان کی کرسی اُن کے بائیں طرف تھی۔ چنانچہ اس وقت گورباچوف کی گفتگو زیادہ تر مجھ سے ہی ہوئی۔

افغانستان پر سوویت روس کے حملہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ حملہ سوویت روس کی ایک غلطی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو پڑوسی ملک سے صرف کوآپریشن چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ کوآپریشن اچھی چیز ہے مگر کوآپریشن ہمیشہ پر امن طریقہ پر ممکن ہوتا ہے نہ کہ مسلّح طریقہ پر۔ اس سلسلہ میں مزید میں نے کہا کہ سوویت روس کی فوجوں کا افغانستان میں مسلّح داخلہ افغانیوں کے لئے ایک سنگین چیلنج تھا۔ افغانیوں کا کلچر وار کلچر ہے۔ وہ مسائل کے حل کے لئے ہمیشہ تشدد کی اصطلاحوں میں سوچتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے روس کے مسلّح اقدام کا جواب دوبارہ مسلّح کارروائی سے دیا۔ اس میں کچھ اور اسباب افغانیوں کے حق میں تھے۔ چنانچہ سخت نقصان کے بعد روس کو افغانستان سے واپس آنا پڑا۔

پھر اس مسئلہ کا ذکر ہوا کہ موجودہ ''ٹررزم'' میں زیادہ حصہ مسلمانوں کا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات درست ہے مگر یہ کچھ مسلمانوں کا فعل ہے۔ اس کا تعلق اسلام سے نہیں۔ اسلام مکمل طور پر ایک پُرامن مذہب ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے قرآن کی کچھ آیتوں کے حوالے دیے۔

کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی ایک عیسائی خاتون نے گورباچوف کی وفات یافتہ اہلیہ رئیسہ کا ذکر کیا۔ اس سلسلہ میں میں نے ان سے پوچھا کہ رئیسہ بظاہر ایک مسلم نام ہے۔ کیا آپ کی اہلیہ ایک مسلم خاتون تھیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں وہ آرتھوڈاکس چرچ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اپنی اہلیہ کے بارے میں اُنہوں نے ایک بات یہ بتائی کہ وہ ماسکو کی منجمد کردینے والی سردی میں بھی صبح کے وقت باہر نکل کر دیر تک واک کرتی تھیں۔ اُن کے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

میز پر لوگوں کے سامنے شراب کا گلاس رکھا جارہا تھا۔ ہوٹل کے آدمی سے میں نے کہا کہ مجھے پانی چاہئے۔ اس پر گورباچوف سے شراب کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ انہوں نے شراب کے نقصانات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ جب میں سوویت یونین کا صدر تھا تو میں نے کوشش کی کہ روسی شراب ووڈکا (vodka) پر پابندی لگاؤں۔ مگر روسی عوام شراب کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ وہ اس اصلاح کو قبول نہ کر سکے۔

گورباچوف دیکھنے میں ایک بھاری بھرکم شخصیت نظر آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کی صحت بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ ڈیسیپٹیو (deceptive) ہے۔ یعنی مغالطہ آمیز ہے۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ انگریزی کم جانتے ہیں اس لئے پوری گفتگو ترجمان کے ذریعہ ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی سوال کا فوراً جواب دیتے ہیں۔ غالباً سوچ کر جواب دینے کی انہیں عادت نہیں۔

اس کے مقابلہ میں میرا تجربہ ہے کہ چین کے لیڈر کسی سوال کا فوراً جواب نہیں دیتے۔ وہ پہلے سوچتے ہیں اور پھر جواب دیتے ہیں۔ غالباً روسی اور چینی کے مزاج کا یہی فرق ہے جس کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ روس میں کمیونسٹ اقتدار ختم ہوگیا، جب کہ چین میں کمیونسٹ اقتدار ابھی تک قائم ہے۔ گورباچوف سوویت یونین کے آخری صدر تھے۔ اُنہوں نے سوویت روس میں پرسترائیکا

(سیاسی آزادی) چلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویت یونین ٹوٹ گیا۔ اس کے برعکس چینی لیڈروں نے تدبر سے کام لیتے ہوئے یہ کیا کہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ اس طرح ہم آہنگی کی کہ سیاسی انتظام اور اقتصادیات دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اُنہوں نے اقتصادی آزادی دیتے ہوئے سیاسی جبر کو باقی رکھا۔ اس طرح اُنہوں نے چین میں کمیونسٹ اقتدار کو بچالیا۔

۱۲ اکتوبر کی صبح ہوئی تو حسب معمول صبح سویرے میری نیند کھل گئی۔ کچھ دیر کے بعد دور سے چرچ کے گھنٹے کی آواز آئی۔ دہلی میں فجر کی اذان کے ذریعہ معلوم ہوتا تھا کہ صبح ہوگئی ہے، یہاں چرچ کے گھنٹہ کی آواز سے صبح کا اندازہ ہوا۔ فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کل کے سفرنامے کے اجزا لکھے۔ اس کے بعد ناشتہ اور ملاقات وغیرہ کی مصروفیات شروع ہوگئیں۔

۱۲ اکتوبر کو کئی پروگرام تھے۔ پہلا پروگرام راؤنڈ ٹیبل میٹنگ کا تھا جو ساڑھے گیارہ بجے زُگ کی تاریخ عمارت گوتچر سال (Gothischer Saal) سے شروع ہوا۔ اس اجتماع میں تقریباً ۵۰ افراد شریک ہوئے۔ یہ دنیا کے مختلف ملکوں سے آئے تھے۔ گویا کہ عالمی ذہن وہاں اکٹھا ہوگیا تھا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Nuclear Terrorism and Prospects of Nuclear Disarmament in the Modern World.

اس اجتماع میں پہلے اس کے صدر مسٹر آندرے بیکوف نے ایک تمہیدی تقریر کی اور موضوع کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد سب سے پہلے مجھے بولنے کا موقع دیا گیا۔ میری تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ نیوکلیر ٹررزم اور عام ٹررزم دونوں کی نوعیت ایک ہے۔ اس لیے ہمیں دونوں کے حل کے لیے ایک ہی طریقِ کار اختیار کرنا ہوگا۔

Nuclear terrorism and non-nuclear terrorism both are same in nature. So we have to deal with both the problem by the same method , that is through sustainable disarmament. In case of nuclear bombs we have discovered a successful technology to extract the plutonium content from the nuclear war machine.
Similar is the case with the terrorist. Here also we have to extract

the poisonous militant thinking from the minds of terrorists and divert their energies to constructive fields. Simply killing some terrorist leaders or destroying some terrorist bases is not enough. Present terrorism is based on an ideology. They have justified their act of terrorism by an ideology. They even believe that suicide bombing is the surest entry visa for eternal paradise. You can kill a body by gun but you cannot kill the spirit by gun or bomb.

۱۲ اکتوبر کو ۶ بجے شام زُگ کے کسینو تھیٹر میں استقبالیہ پروگرام تھا۔ اس موقع پر چند تقریریں ہوئیں۔ ان میں خاص تقریر آندرے بیکوف (Andrey Bykov) کی تھی جو اس ادارے کے چیرمین ہیں۔ ان کی مادری زبان روسی ہے۔ تاہم وہ انگریزی زبان میں بھی بخوبی قدرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں بولتے ہوئے اپنے مشن کا تعارف کرایا۔ انہوں نے بتایا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جوہری بم کی صورت میں تاریخ کے سب سے زیادہ خطرناک بم بننے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ دنیا کے چار بڑے ملکوں کے پاس ایٹم بموں کا تقریباً ۹۰ فیصد ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ملک ہیں — امریکا، روس، برطانیہ اور فرانس۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ چاروں ملک اپنی اکثریت کی بنا پر مسیحی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ساری دنیا میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ایٹم بموں کے اس ذخیرہ کو ختم کیا جائے۔ ہم نے لمبی ریسرچ کے بعد ایک ایسی ٹیکنیک دریافت کی جس کے ذریعہ ایٹم بم کے اس حصہ کو نکال لیا جائے جو اس کا سب سے قیمتی اور اہم حصہ ہے، یعنی پلوٹونیم۔ اور پھر اس کو پرامن مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ اب تک ہم 6500 بم سے پلوٹونیم کا حصہ نکال چکے ہیں اور امریکا اس کو خرید کر بجلی پیدا کرنے کے لیے اسے استعمال کر رہا ہے۔

اُنہوں نے اعلان کیا کہ پیرنٹ باڈی (parent body) کے طور پر ڈیمرگس پیس انٹرنیشنل (Demiurgus Peace International) قائم کیا گیا ہے۔ نیوکلیر ڈس آرمامنٹ فورم اس کا ایک ذیلی حصہ ہوگا۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم امید کرتے ہیں کہ اگلے پچیس سال کے اندر ہم دنیا میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

میرا عام تجربہ یہ ہے کہ بڑی بڑی کانفرنسوں میں جو لوگ آتے ہیں وہ شاندار زبان بولتے ہیں

اوران کے ناموں کے ساتھ شاندار القاب ہوتے ہیں مگر وہ زیادہ تر غیر متعلق (irrelevant) باتیں کرتے ہیں۔ یہ راؤنڈ ٹیبل ڈسکشن بھی اس معاملہ میں بہت زیادہ مختلف ثابت نہ ہوسکا۔ ایک شریکِ اجتماع سے میں نے اپنے اس احساس کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ تاہم مقررین کی چند باتیں جو میں نے وہاں نوٹ کیں ان کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ ساؤتھ افریقہ کے مسٹر ڈیسمنڈ ٹوٹو نے موجودہ تاریک صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ خدا ایک ڈریمر ہے۔ ہمیں بھی اسی طرح ڈریمر اور پرامید ہونا چاہئے:

God is a dreamer. We also ought to be dreamers. I hope you can dream too of a world without a war. We need to be idealists.

اس بات کو مجھے کہنا ہو تو میں اس کو اس طرح کہوں گا کہ آج کی دنیا میں جو تشدد کلچر چل رہا ہے اس کا سبب لوگوں کے اندر پختہ شعور (maturity) کا نہ ہونا ہے۔ لوگ امن کی طاقت کو نہیں جانتے اس لیے وہ بہت جلد تشدد پر اتر آتے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ لوگوں کی شعوری ناپختگی کو ختم کیا جائے اور ان کو امن کے فائدے سے آگاہ کیا جائے۔ اس کے بعد ہی موجودہ تشدد کلچر کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ افلاس سے مایوسی پیدا ہوتی ہے اور مایوسی تشدد کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ سب سے پہلے غریبی اور افلاس کو ختم کریں۔ اس کے بعد ہی دنیا میں پرامن سماج بن سکتا ہے:

Poverty breeds despair, and despair breeds violence.

یہ بات الفاظ کے اعتبار سے خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بے وزن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کم آمدنی اور زیادہ آمدنی کا فرق خود فطری قانون کا نتیجہ ہوتا ہے، نہ کہ کسی کے ظلم کا نتیجہ۔ اس لئے اصل ضرورت یہ ہے کہ مواقع کار زیادہ سے زیادہ کھولے جائیں۔ اس کے بعد لوگ اپنے آپ جدوجہد کرنا شروع کردیں گے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہمارے اندر خود انتقادیت (self-criticism) کا مزاج ہونا چاہئے۔ ہمیں صرف مذمت نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسباب کو دیکھنا چاہئے:

We should not only criticize and condemn
but we must look at the causes.

یہ بات بذاتِ خود درست ہے مگر اصل مسئلہ اسباب کا صحیح تعین ہے۔ اگر اسباب کا صحیح تعین نہ کیا جائے تو بڑی سے بڑی کوشش بھی اکارت ہو کر رہ جائے گی۔ اس کی ایک مثال کمیونزم ہے۔ مارکس نے اسباب کی جو نشاندہی کی تھی اس کے مطابق سو سال تک غیر معمولی جدوجہد کی گئی مگر نتیجہ مزید تباہی کی صورت میں نکلا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ اسباب کی تشخیص درست نہ تھی۔

یوگوسلاویہ کی پرنس الزبتھ نے اپنی تقریر میں کہا کہ دنیا کے مسائل کو ہم صرف خارجی کوشش سے دور نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں داخلی کوشش کرنی پڑے گی۔

You cannot solve world problems from outside.

اس قسم کی بات اکثر لوگ کہتے رہتے ہیں لیکن جب ان سے کہا جائے کہ اپنی بات کو زیادہ متعین (specific) انداز میں بتایئے تو میرا تجربہ ہے کہ وہ ایسا نہیں کر پاتے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ فیشن کے طور پر اس قسم کی بات کہہ دیتے ہیں لیکن اس معاملہ میں وہ اتنا زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتے کہ گہرائی میں اتر کر اس کو زیادہ واضح انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہم اس زمین پر ایک مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں مگر ہم ایک برے مہمان ثابت ہوئے ہیں:

We are just guests on this planet—a very lousy guest.

اس معاملہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انسان خدا کی اس زمین پر جانچ (test) کے لیے رکھا گیا ہے۔ ''مہمان'' کا تصور آدمی کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں کرتا۔ لیکن ''جانچ'' کا تصور جس آدمی کے ذہن میں بیٹھ جائے وہ یقینی طور پر سخت محتاط ہو جائے گا، وہ ذمہ دارانہ زندگی کا طریقہ اختیار کر لے گا۔

امریکا سے آئی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون جو وہاں شوماخر انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹر ہیں، انہوں نے کہا کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت علاقائی بنیاد پر خود کفیل اقتصادی نظام

(self-sufficient regional economy) ہے۔ مگر یہ بات عملی حقائق کے مطابق نہیں۔ یہ زمانہ گلوبلائیزیشن کا زمانہ ہے۔ آج تیزی سے گلوبل اکانومی دنیا میں قائم ہورہی ہے۔ ایسی حالت میں وہی نظریہ درست نظریہ ہے جو زمانہ کے حالات سے مطابقت رکھتا ہو۔ کوئی نظریہ خواہ بظاہر کتنا ہی خوبصورت ہو وہ زمانی تقاضوں کو نظر انداز کرکے قائم نہیں ہوسکتا۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں امن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ امن کس لئے ہوتا ہے۔ امن کا مقصد یہ ہے کہ حالت موجودہ کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا:

Peace is to try to defend statusquo.

امن کی اس تعریف میں ایک بات نہیں آئی ہے۔ وہ یہ کہ نزاع کو ختم کرکے امن قائم کرنے کا مطلب وہی ہے جس کو وقت کا حصول (buy time) کہا جاتا ہے۔ یعنی معتدل ماحول قائم کرکے کام کا موقع حاصل کرنا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت پولیٹیکل لیڈرس مختلف ملکوں میں امن کے لئے کام کررہے ہیں۔ مذہبی رہنماؤں کو چاہئے کہ وہ آئیں اور اس کام کو آگے بڑھائیں:

Religious leaders should come forword and
set off a spark to this new world of peace.

یہ بات صحیح ہے کہ پولیٹیکل لیڈرس یا انٹلکچول لیڈرس امن کے نام پر آج کل کافی سرگرمی دکھارہے ہیں۔ مگر میرے تجربے کے مطابق، یہ بھی ان کی لیڈری کا ایک حصہ ہے۔ میں اس قسم کی بہت سی کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ یہ قائدین امن کانفرنس ٹیبل پر تو خوبصورت الفاظ میں امن کی باتیں کرتے ہیں مگر اس کے بعد وہ اپنا بقیہ پورا وقت اس طرح تفریحی انداز میں گذارتے ہیں جیسے کہ امن ان کا کنسرن (concern) ہی نہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ مذہبی رہنماؤں کی شرکت کوئی واقعی نتیجہ پیدا کرسکتی ہے۔ امن کے قیام کے لیے سب سے پہلی شرط سنجیدگی ہے۔

روس کے سابق صدر میخائیل گورباچوف نے روسی زبان میں تقریر کی جس کا ترجمہ انگریزی

زبان میں کیا گیا۔ ترجمہ کے مطابق، ان کی کچھ باتیں یہ تھیں۔

UN is a relic of the past. Developed nations used everything to their own advantage. We need governance of the world, not govern the world. We need a new world order— more just, more humane.

یہ ساری باتیں خود مقرر پر صادق آرہی تھیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر تھے اور اسی کی بنیاد پر سوویت یونین کے صدر بنے۔ جو کچھ انہوں نے اپنی تقریر میں دوسروں کے بارے میں کہا وہ سب خود اُن کے اوپر اور ان کے سیاسی عقیدے کے اوپر صادق آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ انسان اپنی ناکامی کا اعتراف نہیں کرتا۔ مگر وہ دوسروں سے امید رکھتا ہے کہ وہ اس کو ناقد کا کریڈٹ عطا کریں۔

مسٹر آندرے بیکوف (Andrey Bykov) نے کسی قدر مفصل تقریر کی۔ ان کی تقریر کے کچھ جملے یہ تھے— دنیا میں دہشت گردی وبا کی طرح پھیل رہی ہے۔ کسی طرح ایک نیا نظام بنایا جائے جس میں جوہری ہتھیاروں کو کنٹرول کیا جا سکے:

There prevails an epidemic terrorist situation in the world. How to create a new system of nuclear control.

انہوں نے مزید بتایا کہ ایٹم بموں کا جو ذخیرہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اس کا ۹۰ فیصد حصہ چار قوموں کے پاس ہے— امریکا، روس، برطانیہ اور فرانس۔ یہ چاروں قومیں اکثریت کے اعتبار سے مسیحی قومیں ہیں۔

راؤنڈ ٹیبل میٹنگ کے بعد ہم لوگ قریب کے ایک گیسٹ ہاؤس میں لے جائے گئے۔ اس کا نام تھا راتوس۔کلر (Rathauskeller)۔ یہاں کانفرنس کے شرکاء کے لیے لنچ کا انتظام تھا۔ لنچ کے دوران مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال جاری رہا۔

کھانے کے دوران ہمارے ایک ساتھی نے ویٹر سے بریڈ (bread) کی فرمائش کی۔ ویٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کافی دیر کے بعد ویٹر نے کہا کہ اچھا شاید آپ بروڈ چاہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ تلفظ کے فرق کی بنا پر ویٹر کو ہماری بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ جس چیز کو ہم بریڈ کہتے ہیں اُس کو وہ لوگ بروڈ بولتے ہیں۔

۱۲ اکتوبر کی شام کو شرکاء اجتماع ہوٹل کسینو کے تھیٹر ہال میں اکٹھا ہوئے۔ یہاں روسی نیشنل آرکسٹرا کا ایک پیانو کانسرٹ (Piano Concert) تھا۔ یہ غیر معمولی طور پر ایک بہت بڑا پروگرام تھا جس میں تقریباً ۱۰۰ آرٹسٹوں نے حصہ لیا۔ اس کو پروفیسر ولادمیر (Vladimir Spivakov) نے کنڈکٹ کیا۔ ولادمیر اپنے کام کو اتنی زیادہ محنت اور لگن کے ساتھ کر رہے تھے کہ ان کا چہرہ واضح طور پر پسینہ سے شرابور ہوگیا۔ حاضرین اتنا زیادہ خوش تھے کہ بار بار تالیوں کے ذریعہ خراج تحسین ادا کر رہے تھے۔ ہر آئٹم جب ختم ہوتا تو پروفیسر ولادمیر اسٹیج کے اوپر حاضرین کی طرف اپنا چہرہ کر کے کھڑے ہوتے اور رکوع کی طرح جھک کر حاضرین کا شکریہ ادا کرتے۔ ایک شخص نے پروفیسر ولادمیر سے اس کی بابت پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے فخر آمیز خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

آرکسٹرا کے اس شو کے بعد دوسرا پروگرام تھا جو اس کانفرنس کا سب سے اہم جز تھا۔ وہ تھا دنیا بھر کے سات منتخب لوگوں کو پیس کا ایوارڈ دینا۔ یہ پروگرام زُگ کے کسینو تھیٹر میں تھا۔ یہ ایک محل نما شاندار ہال تھا جس میں تمام لوگ اکٹھا ہوئے۔

اس کانفرنس کا خاص مقصد دنیا بھر کے سات منتخب افراد کو پیس انٹرنیشنل کی طرف سے انٹرنیشنل پیس ایوارڈ دینا تھا۔ یہ تقریب ۱۲ اکتوبر کو شام کے سات بجے زُگ کے شاندار کسینو تھیٹر میں ہوئی۔ مجھے اسی ایوارڈ کے لیے یہاں بلایا گیا تھا۔ میرے علاوہ چند اور لوگوں کو اوارڈ دیا گیا، ان میں روس کے صدر مسٹر ولادیمیر پُتن اور افریقہ کے نوبل انعام یافتہ آرچ بشپ ڈسمانڈ ٹوٹو شامل ہیں۔

اس پروگرام کے لیے کسینو تھیٹر کو خصوصی طور پر سجایا گیا تھا۔ خوبصورت اسٹیج پر سات کرسیاں ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر ان لوگوں کو بیٹھنا تھا جن کو ایوراڈ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ ہر کرسی کے اوپر اس ملک کا جھنڈا لہرا رہا تھا جس سے صاحب ایوارڈ کا تعلق تھا۔ میری کرسی کے اوپر انڈیا کا جھنڈا لگایا گیا تھا۔ اس طرح ہر جگہ دوسرے چھ جھنڈوں کے ساتھ انڈیا کا جھنڈا بھی لہرایا گیا۔

اس موقع پر بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر ایک کو کسی خاص شخصیت کے ذریعہ انعام دلوایا گیا۔ انعام لینے کے بعد ہر ایک نے مختصر تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ دنیا میں امن قائم کرنے کا کام پر امن طریقہ سے ہوگا، نہ کہ تشدد کے طریقہ سے۔ اس سلسلہ میں میں نے مسیح کے مشہور قول کا حوالہ دیا کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو۔ میں نے کہا کہ دشمن سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دشمن کے مسئلہ کو محبت کی طاقت سے حل کرو۔ ٹررسٹ بھی اسی طرح ایک دشمن ہے۔ اس لیے مسیح کی اس تعلیم کے مطابق، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ٹررسٹ سے محبت رکھو۔ یعنی ٹررزم کے مسئلہ کو محبت کی طاقت سے حل کرو۔ ٹررزم کے چیلنج کا مقابلہ محبت اور امن کی طاقت سے کرو۔

Jesus Christ has said: Love your enemy. It means: Solve the problem of enmity by the power of love. Meet the challenge of your enemy by the power of love and peace. So is the case of terrorist. Terrorist is also an enemy. So according to this formula, one can say that solve the problem of terrorism by the power of love and peace.

اس موقع پر مجھ کو جو ایوارڈ دیا گیا اس میں دوسری چیزوں کے ساتھ ایک سرٹیفکٹ شامل تھا۔ اس سرٹیفکٹ میں یہ لکھا گیا تھا:

Nuclear Disarmament Forum AG

Presented to

Maulana Wahiduddin Khan

for outstanding achievements in strengthening peace among nations.

Demiurgus Peace International Award 2002

سوئزرلینڈ کے مختلف حصوں میں بار بار سفر کے دوران جانے کا اتفاق ہوا۔ جو مناظر دیکھنے میں آئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ یہاں کے درختوں میں ہرے رنگ کی پتیوں کے ساتھ ایک اور رنگ کی پتیاں ہوتی ہیں جن کو سنہرا رنگ یا گولڈن کلر کہا جاسکتا ہے۔

یہاں کے درخت کی پتیوں میں اس قسم کا رنگ کیوں ہے۔ اس کا راز اس وقت سمجھ میں آیا جب کہ مجھے ایک اور تجربہ ہوا۔ سوئزرلینڈ ایک سرد ملک ہے۔ یہاں اکثر بدلی یا کہر رہتا ہے جس کی وجہ سے دن ہونے کے باوجود سورج اکثر چھپا رہتا ہے۔ کئی بار مجھے اس قسم کا تجربہ ہوا کہ سورج بظاہر نکلا ہوا نہیں ہے مگر فضا میں اجالا نظر آتا ہے۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اجالا انہی سنہری پتیوں کی وجہ سے ہے۔ یہ سنہری پتیاں فضا میں ہلکی روشنی پیدا کرتی رہتی ہیں۔ یہ خدا کی قدرت کی کیسی عجیب نشانی ہے۔ فطرت میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں۔

چند معلومات

سوئزرلینڈ وسط یورپ میں واقع ہے۔ وہ ایک لینڈ لاکڈ (land locked) ملک ہے۔ سوئزرلینڈ امن کے اعتبار سے ایک مثالی خطہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ امن اختلاف کو ختم کرکے حاصل نہیں ہوا بلکہ اختلاف کو گوارا کرکے حاصل ہوا۔ سوئزرلینڈ ایک ایسی نیشن ہے جس کے باشندوں کے درمیان نسلی روایت اور زبان اور مذہب کے اعتبار سے وحدت نہیں۔ مگر وہ ایک ایسی نیشن ہے جو ان اختلافات کے باوجود متحد اور خوشحال ہے:

Switzerland is a nation the people of which have no unity of ethnic heritage nor of language or relegion but it is a nation that nonetheless is united and prosperous. (17/867)

ہندستان میں نہ سماجی اتحاد ہے اور نہ خوشحالی۔ اس کا سبب کچھ لیڈر اور دانشور یہ بتاتے ہیں کہ یہاں مختلف مذہب اور کلچر پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے پچاس سال سے یہاں یہ کوشش کی جارہی ہے کہ گروہی اختلاف کو مٹاؤ تاکہ ملک میں اتحاد قائم ہوسکے۔ مگر یہ ایک ناقابلِ عمل منصوبہ ہے۔ اسی لیے وہ اب تک کامیاب نہ ہوسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد اختلافات کے باوجود متحد ہونے کا نام ہے، نہ کہ اختلافات کو مٹا کر متحد ہونے کا۔

ہزار سال پہلے مسلمان یورپ میں اقدام کرتے ہوئے سوئزرلینڈ کے علاقہ میں داخل ہوگئے تھے۔ مگر یہ داخلہ بہت محدود مدت تک رہا۔ وہ کسی نتیجہ کے بغیر ختم ہوگیا۔ ایک برطانی پروفیسر

جارج رچرڈ پوٹر (George Richard Potter) نے لکھا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں مسلمان سوئزرلینڈ کے علاقہ میں داخل ہوگئے۔ مگر وہ اپنے مرکز سے اتنا زیادہ دور تھے کہ وہ ایک وقتی خلل پیدا کرنے کے سوا وہاں کچھ اور نہ کر سکے:

In the 10th century Muslims reached Swiss territory, but they were too far from their base to have any thing more than nuisance value. (17/879)

پروفیسر جارج رچرڈ پوٹر یونیورسٹی آف شیفیلڈ میں قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کے اُستاد تھے۔ ۱۹۸۱ میں اُن کی وفات ہوئی۔ وہ سوئزرلینڈ کی تاریخ کے بارے میں ایک کتاب کے شریک مصنف (co-author) تھے۔ اس کتاب کا نام یہ ہے:

A Short History of Switzerland.

پچھلے کئی سو سال کے درمیان سوئزرلینڈ مسلسل جنگ اور نزاع کی سرزمین تھا۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا باہمی ٹکراؤ، روس اور فرانس اور جرمنی سے جنگ، وغیرہ۔ مگر سوئزرلینڈ کی قومی پالیسی ہمیشہ دو اصولوں پر مبنی تھی۔ امن اور غیر جانبداری۔ اسی پالیسی کا یہ نتیجہ ہے کہ سوئزرلینڈ آج دنیا کا سب سے زیادہ پُر امن اور خوش حال ملک بن گیا ہے، حالاں کہ سوئزرلینڈ کے پاس قدرتی وسائل کے اعتبار سے پانی کے سوا کوئی اور قابلِ ذکر چیز موجود نہیں۔

سوئزرلینڈ کے تعمیری مزاج کا اندازہ ایک مثال سے ہوگا۔ ۱۸۴۸ میں سوئزرلینڈ میں ایک فیڈرل اسٹیٹ بنی۔ اس کے لیے دو چیمبر (ایوان) کی گورنمنٹ بنی۔ اس کے لیے پریزیڈنٹ کے سالانہ انتخاب کا جو اصول مقرر کیا گیا وہ یہ تھا، برابر والوں میں سے پہلا:

The president, elected annually was simply first among equals. (17/886)

۱۹۱۴ میں پہلی عالمی جنگ چھڑی تو یورپی علاقوں کے بہت سے سیاسی پناہ گزیں اپنے ملکوں سے بھاگ کر سوئزرلینڈ آ گئے۔ ان سیاسی پناہ گزینوں میں سے ایک مشہور کمیونسٹ ولادیمیر لینن تھا۔

سوئزرلینڈ ایک غیر جانب دار ملک کی حیثیت رکھتا تھا۔ لینن وہاں ستمبر ۱۹۱۴ میں پہنچا۔ وہاں اس کے کچھ ساتھی بھی اکٹھا ہو گئے جو اس وقت بالشویک کہے جاتے تھے۔ جنگ کے نتیجہ میں ان کا رابطہ اپنے وطن روس سے اور دوسرے علاقوں سے منقطع ہو گیا۔ تاہم انہوں نے ۱۹۱۵ اور ۱۹۱۶ میں دو اینٹی وار کانفرنسیں سوئزرلینڈ میں منعقد کیں۔ ان کانفرنسوں میں لینن کا نعرہ یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ وار کو سول وار میں بدل دو:

Transform the imperialist war into civil war. (10/794)

یہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا منفی طریقہ ہے۔ اکثر لیڈر ایسا کرتے ہیں کہ وہ بظاہر ایک مثبت مقصد کے لیے اُٹھتے ہیں مگر اُس کے حصول کے لیے وہ منفی طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ مثبت مقصد ہمیشہ مثبت طریقہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ منفی طریقہ کبھی کسی کو مثبت انجام تک پہنچانے والا نہیں۔

تاریخ کی پہلی بین اقوامی مجلس سوئزرلینڈ میں قائم ہوئی۔ یہ جمعیتِ اقوام (League of Nations) تھی جو جنگ عظیم اول کے بعد ۱۹۲۰ میں قائم ہوئی۔ اس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں تھا۔ اس کا مقصد بین اقوامی تعاون (international co-operation) بتایا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجہ میں یہ جمعیت ٹوٹ گئی۔ جنگ کے خاتمہ پر دوسری بین اقوامی مجلس اقوامِ متحدہ (United Nations) کے نام سے بنی۔ اس کا صدر دفتر نیویارک میں ہے۔

لیگ آف نیشنز جب سوئزرلینڈ میں قائم ہوئی تو مسلم رہنماؤں نے اُس پر منفی تبصرے کیے۔ اس منفی تبصرہ کی ایک مثال اقبال کے اس فارسی شعر میں نظر آتی ہے:

چیست جمعیتِ اقوام کفن دزدے چند بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

یعنی جمعیت اقوام کیا ہے۔ کچھ کفن چوروں نے قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنالی ہے۔ یہ تبصرہ بلاشبہہ نادانی کا تبصرہ ہے۔ مختلف مفادات کی اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جو اجتماعی ادارہ بنایا جائے وہ ہر ایک کی پسند کے مطابق نہ ہو۔ ایسی حالت میں اصل کام اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنا نہیں

ہے بلکہ یہ تلافی کرنا ہے کہ ناپسندیدگی کے باوجود اُس میں وہ کون سا موافق جزء ہے جس کو اپنے حق میں استعمال کیا جاسکے۔ اسی کا نام تدبّر ہے۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کا کوئی مسلم رہنما اس تدبّر کا ثبوت نہ دے سکا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔

سوئزرلینڈ میں زیادہ قدرتی ذخائر نہیں۔ وہاں کی سب سے بڑی دولت سارے ملک میں پھیلی ہوئی جھیلیں ہیں۔ سوئزرلینڈ پہاڑوں کا ایک ملک ہے۔ یہاں عام طور پر ہلکی بارشیں ہوتی ہیں۔ ان کی وجہ سے پہاڑوں کے اوپر برف جمتی رہتی ہے۔ یہ برف پگھل کر بہتی ہے تو اُس سے بڑی بڑی جھیلیں بنتی ہیں۔ سوئزرلینڈ کے لوگوں نے جھیل کی اس دولت کو بھرپور استعمال کیا ہے۔ اُنہوں نے جھیلوں کو سنوار کر اُنہیں تفریح گاہ کی حیثیت دے دی ہے۔ وہ اُن سے پانی حاصل کرتے ہیں۔ اُن سے اپنے کھیتوں اور باغوں کی آبپاشی کرتے ہیں۔ اُن سے سستی بجلی پیدا کرتے ہیں، وغیرہ۔

ہندستان میں اس قسم کی جھیلیں تو نہیں ہیں مگر یہاں کثرت سے ندیاں پائی جاتی ہیں۔ ان ندیوں کو استعمال کرکے اُن کو عظیم دولت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے بڑے ڈیم بنانے پر جو بے شمار دولت خرچ کی گئی وہ اگر دریاؤں کے صحیح استعمال پر خرچ کی جاتی تو آج ہندستان میں پانی کا کوئی مسئلہ موجود نہ ہوتا۔

جہاں تک میں جانتا ہوں، اس مسئلہ میں پہلا قابلِ ذکر نام ایک انگریز کا ہے۔ یہ لفٹننٹ جنرل سَر آرتھر کاٹن (Lt. Gen. Sir Arthur Cotton) ہے۔ برٹش حکومت کے زمانہ میں ۱۸۳۹ میں اُس نے جنوبی ہند میں ایک نہایت اہم کام شروع کیا تھا مگر وہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

اس انگریز نے اپنی اس اسکیم کا نام انٹربیسن ٹرانسفر آف واٹر (Inter-Basin Transfer of Water) رکھا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے مختلف دریاؤں کو نہروں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے تاکہ ایک دریا کا پانی دوسری دریا تک پہنچنے لگے۔ تقریباً ہر سال ہندستان میں یہ منظر سامنے آتا ہے کہ ملک کے ایک حصہ میں زیادہ بارش سے دریاؤں میں طوفان آجاتا ہے جس کا زبردست نقصان بھگتنا پڑھتا ہے۔ عین اُسی وقت ملک کے دوسرے حصوں میں بارش نہ ہونے یا کم ہونے کی وجہ سے

ندیاں سوکھی پڑی رہتی ہیں۔ اگر ملک کی مختلف دریاؤں کو نہریں کھود کر ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے تو یہ فرق ختم ہو جائے گا۔

اس کے بعد یہ ہوگا کہ زیادہ بارش والے حصہ کا پانی نہروں سے گذر کر کم بارش والے حصہ میں پہنچ جائے گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ ملک کے لیے ایک آبی انقلاب کے ہم معنیٰ ہوگا۔ اس کے بہت سے فائدے حاصل ہوں گے — پانی کی قلت کا خاتمہ، آبپاشی، بجلی کی تیاری، آبی راستوں کے ذریعہ سفر کی آسانی، وغیرہ وغیرہ۔ یہاں ہندستانی دریاؤں کا ایک نقشہ دیا جا رہا ہے۔ اس سے مذکورہ اسکیم کی نوعیت کا اندازہ ہوگا۔

Link rivers in 10 years: SC

New Delhi: The Supreme Court on Thursday asked the centre to consider linking all major rivers within 10 years—instead of the proposed 41 years—at a huge expenditure of Rs 560,000 crore at today's prices.

While the Centre said it proposed to complete the linking job by 2043, the court said it should accomplish the plan by 2012 to effectively control flood and drought situations.

A Bench comprising Chief Justice B N Kirpal, Justice Y K Sabharwal and Justice Arijit Pasayat said that a task force would work out the modalities for creating the National River Network (NRN).

Attorney general Soli J Sorabjee said that the President and the Prime Minister both have given their personal attention to the issue and were in favour of the same being worked out at an early date.

The Centre in its affidavit said that it woud be able to link the peninsular rivers by the year 2035 and the Himalayan rivers by the year 2043.

However, the Bench said that the proposal was being considered for last two decades without anything happening and it would be in the interest of all that the task was completed in the next 10 years.

The Bench asked Sorabjee to give the Centre's response to the court on December 16, the next date of hearing on the issue which was taken up suo moto by the court. *(Times of India, November 2, 2002)*

مذکورہ بالا معلومات ڈاکٹر وائی ایس راجن (Scientific Secretary, New Delhi) سے حاصل ہوئیں۔

فرانسیسی مفکر ژان زاک روسو سوئزرلینڈ کے شہر جنیوا میں ۱۷۱۲ میں پیدا ہوا۔ وہ قومی آزادی کے فکری معماروں میں سمجھا جاتا ہے۔ اُس کی کتاب معاہدۂ عمرانی (Contract Social) بہت

مشہور ہے۔ اُس نے اپنی آٹو بیا گرافی میں اپنے بارے میں یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ ایک بڑا گنہگار (great sinner) تھا۔ اُس نے مادّی مصلحت کے تحت کیتھولک مذہب کو چھوڑ کر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرلیا اور پھر وہ دوبارہ کیتھولک بن گیا۔

روسو نے اپنی آٹو بیا گریفی میں لکھا ہے کہ ایک گھر جس میں وہ ۱۷۳۰ میں رہتا تھا، وہ ایک بشپ کی دعا کی وجہ سے معجزاتی طور پر آگ میں جل جانے سے بچ گیا:

A house in which he was living in 1730 had been miraculously saved from a fire by a bishop's prayers. (HWP/661)

اس قسم کا واقعہ ہمیشہ کسی نہ کسی معلوم یا غیر معلوم مادی سبب کے تحت ہوتا ہے۔ مگر معتقدین اُس کو اپنے بزرگ کی کرامت کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی غلط انتساب (attribute) ہے جو تمام کراماتی قصوں کا اصل ماخذ ہے۔

مشہور جرمن مفکر فریڈرش نٹشے (وفات ۱۹۰۰) کا آخری زمانہ زیادہ تر سوئزرلینڈ میں گذرا۔ اُس کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ وہ ۱۸۸۸ میں دیوانہ (insane) ہوگیا۔ اور اسی دیوانگی کی حالت میں اس کی وفات ہوئی۔ (HWP/728)

میں نے اپنے مطالعہ میں پایا ہے کہ کئی بڑے اسکالر اس قسم کے افسوس ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اکثر ایک شدید قسم کے ذہنی تضاد میں مبتلا رہتے ہیں۔ تفکیری سطح پر وہ کسی یقینی صداقت کو دریافت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی عالمانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے مسلسل یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے انسان کی حیثیت سے پیش کریں جس نے حقیقت اعلیٰ کو دریافت کیا فکری سطح پر یہی داخلی تضاد غالباً اُن کو آخر کار دیوانہ بنا دیتا ہے۔ کسی عالی دماغ انسان کے لیے بلاشبہہ یہ سب سے بڑی نعمت ہے کہ وہ ایک ایسی سچائی کو دریافت کرے جس پر وہ پورے یقین کے ساتھ جی سکتا ہو۔ مذکورہ حادثہ اکثر اُن ذہین لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جن کی فکری جڑیں الہامی صداقت پر مبنی نہ ہوں۔

ہندستانی لیڈر مہاتما گاندھی ایک سفر کے دوران دسمبر ۱۹۳۱ میں سوئزرلینڈ کے شہر جنیوا آئے تھے۔ یہاں اُنہوں نے وکٹری ہال میں ایک تقریر کی۔ اُنہوں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں اُن میں سے ایک یہ تھی کہ سچائی خدا ہے: Truth is God

فرانسیسی مصنف رومین رولاں (Romain Rolland) نے سچائی کے اس تصور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ درست ہے کہ سچائی خدا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں خدا کی ایک اہم صفت کا ذکر موجود نہیں، اور وہ سرور ہے:

If it is correct, that "Truth is God", it appears to me that it lacks one important attribute of God: Joy. (LMG: 293)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہنا کہ سچائی خدا ہے، یہ خدا کے وجود کی نفی ہے۔ خدا ایک باشعور وجود ہے۔ اگر وہ باشعور وجود نہ ہو تو وہ خدا بھی نہیں۔ سچائی ایک مجرّد صفت ہے، وہ کوئی زندہ وجود نہیں۔ اس لیے خدا کے اعتراف کی یہ کوئی صحیح تعبیر نہیں کہ خدا سچائی ہے یا سچائی خدا ہے۔

سولہویں صدی کے یورپ میں چرچ کا غلبہ تھا۔ بہت سے لوگ چرچ کے حکم پر صرف اس لیے ہلاک کر دیے گئے کہ وہ چرچ کے مسلّمہ عقائد پر کلام کرتے تھے۔ اُنہیں میں سے ایک میخائل سروٹس (Michael Servetus) ہے۔ اُس کو ۱۵۵۳ میں اسپینیوں کی ایک مذہبی عدالت نے پھانسی کا حکم دے دیا۔ اُس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ یہ کہتا تھا کہ تثلیث کا عقیدہ (trinity) بائبل میں موجود نہیں۔ اُس کو جب مذہبی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تو وہ بھاگ کر سوئزرلینڈ آ گیا۔ اس لیے کہ مذہبی عدالتیں کیتھولک چرچ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور سوئزرلینڈ اُس زمانہ میں کالون (Calvin) کے اثر سے پروٹسٹنٹ ملک بنا ہوا تھا۔ (HD/322)

تثلیث کا عقیدہ مسیحی مذہب میں بنیادی اور مرکزی عقیدہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ تثلیث کی کوئی اصل بائبل میں موجود نہیں۔ ایک بار میں نے ایک یوروپین پادری سے پوچھا کہ تثلیث کا عقیدہ بائبل میں کہاں ہے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک بائبل کا انگریزی ترجمہ اُلٹتے پلٹتے رہے۔

اُنہوں نے بعض آیتیں پیش کیں۔ میں نے کہا کہ ان آیتوں میں صراحت کے ساتھ تثلیث کا عقیدہ مذکور نہیں اور کسی مذہب کا بنیادی عقیدہ صراحت کے ساتھ اُس کی مقدس کتاب سے نکلنا چاہئے، نہ کہ خودساختہ تاویل کے ذریعہ۔ آخر کار وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرکے خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔

جدید طرز کی گھڑیوں کے سلسلہ میں سوئزرلینڈ کو بہت زیادہ شہرت ملی ہے۔ اس سے پہلے قرونِ وسطیٰ میں ترکی میں روایتی گھڑیاں بنتی تھیں۔ مسلم کاریگر انہیں بناتے تھے اور باہر کے ملکوں میں انہیں مارکیٹ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد یورپ میں اسپرنگ دار گھڑیاں بننے لگیں۔ سوئزرلینڈ اس قسم کی گھڑیوں کی صنعت کا خاص مرکز تھا۔ ترکی (استانبول) کے کاریگر اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکے:

(After the) steady improvement in pendulum—clocks and spring-driven watches in Europe, with which the Istunbul-based clock makers were not able to keep pace. By the early years of the eighteenth century, watch making in Turkey virtually came to an end. (MDE/233)

موجودہ زمانہ میں مسلم قوموں کے ساتھ ہر شعبہ میں یہی معاملہ پیش آیا ہے۔ روایتی صنعت کے دور میں دمشق اور بغداد اور قرطبہ اور استانبول جیسے مسلم شہر مرکزی حیثیت حاصل کئے ہوئے تھے۔ مگر جب سائنٹفک صنعت کا دور آیا تو مسلمان اُس میں پچھڑ گئے۔ وہ جدید دور کا ساتھ نہ دے سکے۔ یہ پسماندگی اتنی بڑھی کہ وہ فکری امور تک جا پہنچی۔ مثلاً موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اور دانشور تشدد کو جہاد بتا کر اُسے گلوریفاری کرنے میں مشغول ہیں جب کہ جدید دنیا فکری اور نظری حیثیت سے تشدد کو دورِ قدیم کی چیز سمجھ کر ترک کر چکی ہے۔

سوئزرلینڈ میں مسلمان بہت کم ہیں۔ تاہم یہاں کے شہروں میں مسلمانوں کی ایک تعداد موجودہ ہے۔ یہ مسلمان زیادہ تر عرب ملکوں سے یا ترکی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ سوئزرلینڈ کے شہروں میں بہت سی مسجدیں ہیں۔ میں سفر کرکے چند مقامات پر پہنچا تاکہ یہاں کی مسجدوں کو دیکھوں مگر یہ مسجدیں زیادہ تر گھروں کے ایک حصہ کو عبادت کے مخصوص کرکے بنائی گئی تھیں۔ سوئزرلینڈ میں بعض مستقل مسجدیں بھی ہیں مگر میں اُن کو دیکھ نہ سکا۔ ان مسجدوں سے وابستہ کچھ

مسلمانوں سے ملاقات ہوئی مگر اُن سے کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوسکی۔ کیوں کہ وہ نہ انگریزی زبان جانتے تھے اور نہ عربی زبان۔ بعض ایسے افراد ملے جو ٹوٹی پھوٹی عربی بول سکتے تھے۔ اُن سے کچھ معمولی قسم کی گفتگو ہوئی۔ اُنہوں نے بتایا کہ سوئزرلینڈ میں مسلمانوں کے لیے دینی اعتبار سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

سوئزرلینڈ میں جو "مسجدیں" دیکھنے میں آئیں اُن میں سے ایک وہ مسجد تھی جس کو مقامی ترکوں نے قائم کیا ہے۔ اس مسجد میں چند ترک ملے۔ وہ غالباً لیبر کلاس کے لوگ تھے۔ وہ صرف ترکی زبان بول سکتے تھے اس لیے اُن سے کوئی گفتگو نہ ہوسکی۔ البتہ اُنہوں نے ۱۸ صفحہ کا ایک پمفلٹ دیا جو ترکی زبان میں تھا۔ اس کی چھپائی معمولی تھی۔ اس پمفلٹ کے آخر میں اُس کا زیورک کا پتہ چھپا ہوا تھا۔ اس تعارف نامہ کے صفحۂ اول پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد اُس کا عربی نام اس طرح درج تھا: الجمعیة العُلیا لاتحاد الجمعیات الاسلامیة فی سویسرا۔ اُس کے نیچے غالباً ترکی زبان میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

INSAN VE UYUM

مغرب میں مقیم ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ میڈیا مسلمانوں کے معاملہ میں ہمیشہ تعصب برتتا ہے۔ انہوں نے میڈیا کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ ایسا کیوں ہے کہ یہودی جب فلسطینیوں کے خلاف متشددانہ حملہ کرتے ہیں تو صرف یہ کہا جاتا ہے کہ اسرائیلیوں نے ایسا اور ایسا کیا۔ مگر ایسے موقع پر ایسا نہیں کہا جاتا کہ یہودیوں نے ایسا کیا۔ اس نے کہا کہ یہی معاملہ آئرلینڈ کی آئی آر اے (IRA) کا ہے۔ ان کے اس قسم کے عمل کو عیسائیوں کا عمل نہیں بتایا جاتا مگر مسلمان جب کسی متشددانہ عمل میں ملوث پایا جاتا ہے تو اس وقت مغربی میڈیا اس کو اسلام کی طرف منسوب کرکے مسلمانوں کے مذہب کی مذمت کرنے لگتا ہے:

Why is it that when the Jews commit a terrorist act against the Palestinians it is only said that the Israelis have done this or that, but it is not said that the Jews did it. The same is of the IRA in

Ireland; whose actions are not referred to as actions by the Christians, yet when a Muslim gets embroiled in a terrorist action, the western media is quick to condemn Islam itself.

مغربی میڈیا کے خلاف یہ اعتراض غلط ہے۔ رپورٹنگ کا مذکورہ فرق ایک فطری فرق ہے۔ اسرائیل اور آئرلینڈ کے لوگ جو تشدد کرتے ہیں وہ قومی نام پر کرتے ہیں اس لیے وہ ان کی قوم کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مسلم ''مجاہدین'' اپنا تشدد اسلام اور اسلامی جہاد کے نام پر کرتے ہیں اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ اُن کا تشدد اسلام کے نام سے رپورٹ کیا جائے۔

میرا یہ سفر ایک ہفتہ کا سفر تھا۔ اس سفر میں میں نے انڈیا سے لے کر یورپ تک ہر قسم کے مناظر دیکھے۔ مگر ہر جگہ صرف مادی سرگرمیاں نظر آئیں۔ میں نے سوچا کہ انسان کی دو ضرورتیں ہیں، مادی ضرورتیں (material needs) اور روحانی ضرورتیں (spiritual needs)۔ موجودہ دنیا میں تمام انسانی سرگرمیاں مادی ضرورتوں کی بنیاد پر چل رہی ہیں۔ روحانی ضرورتوں کی بنیاد پر حقیقی معنوں میں کوئی سرگرمی کہیں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مادّی اعتبار سے ساری دنیا میں سامان حیات کی فراوانی ہے۔ مگر روحانی اعتبار سے آج کا انسان فاقہ کی حالت سے دوچار ہو رہا ہے۔

دہلی میں میں محدود طور پر اسپریچول کونسلنگ کا کام کرتا ہوں۔ اس میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی شریک ہوتے ہیں۔ ایک ہندو خاتون دو دن میرے ''روحانی کلاس'' میں شریک ہوئیں۔ وہ اُس سے کافی متاثر ہوئیں۔ وہ پچھلے بیس سال سے روزانہ بلاناغہ مندر جایا کرتی تھیں۔ میں نے کہا کہ بیس سال میں سات ہزار سے زیادہ دن ہوتے ہیں۔ آپ سات ہزار دن تک مندروں میں گئیں اور ہماری کلاس میں صرف دو دن آئیں۔ آپ کے بیان کے مطابق، آپ کو ہماری کلاس میں روحانی غذا ملی۔ اب بتایئے کہ سات ہزار دن تک مندروں میں جانے سے آپ کو وہاں کتنی روحانی غذا ملی تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ کچھ بھی نہیں۔ مندر میں تو صرف کچھ ظاہری قسم کے رسوم (rituals) ادا کیے جاتے ہیں۔ وہاں روحانی غذا یا فکری ترقی ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

میں نے کہا کہ یہی حال آج کل ہر مذہبی مقام کا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کی درگاہوں میں بھی اسی

طرح صرف کچھ بے روح قسم کے مراسم ادا کیے جاتے ہیں۔ وہاں جانے والوں کو کسی قسم کی فکری اور روحانی ترقی نہیں ملتی۔ پھر میں نے کہا کہ مذہب سچائی کا نمائندہ ہے۔ وہی سرگرمی حقیقی معنوں میں مذہبی سرگرمی ہے جس سے لوگوں کو روحانی خوراک ملے، جس سے لوگوں کو ذہنی ترقی ملتی ہو۔ بے روح رسوم و آداب کا کوئی تعلق مذہب سے نہیں۔

۱۳ اکتوبر کو ملاقاتوں کے علاوہ ایک خاص پروگرام ''بوٹ پر لنچ'' کا تھا۔ ہم لوگ پارک ہوٹل سے کار کے ذریعہ سوئزرلینڈ کے ایک اور شہر لوسرن (Luzern) لے جائے گئے۔ وہاں ایک بہت بڑی جھیل ہے جس کا نام لوسرن ہے۔ اس جھیل میں لوگ بوٹنگ کیا کرتے ہیں۔ ہمیں ایک جدید طرز کی بوٹ پر لے جایا گیا۔ اس دومنزلہ بوٹ میں کرسیوں پر بیٹھنے کا انتظام تھا۔ یہ بوٹ جھیل میں چل رہی تھی مگر اس کی رفتار کم رکھی گئی تھی تاکہ چاروں طرف کے خوبصورت مناظر کو لوگ دیکھ سکیں۔ بوٹ اتنے پرسکون طور پر چل رہی تھی کہ اس پر آسانی کے ساتھ لکھنے کا کام کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اپنے سفرنامہ کے کچھ اجزاء اسی بوٹ پر تیار کیے۔ بوٹ جھیل کے صاف شفاف پانی پر تیر رہی تھی۔ چاروں طرف سرسبز درختوں کے مناظر تھے۔ یہ ماحول بے حد خوبصورت تھا۔ اسی قسم کے خوبصورت مناظر کو کشمیر میں دیکھ کر بابر نے کہا تھا:

اگر فردوس بر روئے زمین است　　همین است و همین است و همین است

مگر میں نے جب سوئزرلینڈ میں فطرت کے مناظر دیکھے تو میرے دل نے کہا کہ خدا نے یہ خوبصورت مناظر دنیا میں اس لیے رکھے ہیں تاکہ انسان اس کے ذریعہ جنت کا ابتدائی تعارف حاصل کرسکے۔ دنیا کے یہ مناظر اُخروی جنت کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہیں نہ کہ اس لیے کہ انہی کو جنت سمجھ کر اُن کے اندر اپنی خوشیوں کی دنیا بنانے کی کوشش کی جائے۔

بوٹ کے اوپر کرسیوں کے ساتھ میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگوں کو انہی میزوں پر لنچ دیا گیا۔ جدید طرز کی خوبصورت بوٹ پانی پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور لوگ اپنے کھانے پینے میں مشغول تھے۔

بوٹ کے اوپر ایک سبق آموز منظر یہ دکھائی دیا کہ ہر مرد و عورت بار بار ہنس رہے تھے اور قہقہہ لگا رہے تھے۔ میں خود تو کسی قدر فاصلہ پر ایک الگ کرس پر خاموشی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب جو اُن لوگوں کے ساتھ شریک تھے، اُن سے میں نے پوچھا کہ وہ کون سی بات تھی جس پر یہ لوگ اتنا زیادہ ہنس رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان تعلیم یافتہ لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر بات میں ایک تفریحی جملہ بول دیتے ہیں جس کو سن کر لوگ ہنس پڑتے ہیں۔ مثلاً اس بوٹ پر شطرنج (Chess) کے ایک مشہور کھلاڑی بھی موجود تھے۔ ایک صاحب نے ان کے ساتھ شطرنج کھیلا اور ہار گئے۔ اس پر ان کے ایک ساتھی نے لائٹ موڈ میں انہیں خطاب کرتے ہوئے کہا: میرے ہارنے والے دوست (My defeated friend)۔ یہ سن کر لوگ ہنس پڑے۔

یہ پڑھے لکھے لوگوں کی تفریح کا طریقہ ہے۔ وہ ہر بات میں ایک اچھوتا جملہ شامل کر دیتے ہیں جس کو سن کر لوگ ہنس پڑتے ہیں۔ یہ تفریح کلچر موجودہ زمانہ میں بہت عام ہو چکا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس غیر سنجیدہ انداز نے تعلیم یافتہ لوگوں کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص پروفیشن میں مادی تقاضے کی بنا پر تو ضرور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ وہاں وہ اپنے کو سنجیدہ انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کا ہر تعلیم یافتہ اپنے پروفیشن کے محدود دائرہ میں تو ایک صاحب علم انسان نظر آتا ہے مگر پروفیشن کے باہر دوسرے شعبوں کے اعتبار سے اس کی سوچ مقابلۃً سطحی ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دوسرے پہلوؤں میں اس کا ذہنی ارتقاء ہی نہیں ہوتا۔

میں اپنی زندگی میں بے شمار لوگوں سے ملا ہوں۔ ان کی تقریریں سنی ہیں اور تحریریں پڑھی ہیں۔ میں نے پایا ہے کہ موجودہ زمانہ کے بیشتر لوگ دہرا شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک پہلو سے وہ آخری حد تک مکمل ہوتے ہیں اور دوسرے پہلو سے آخری حد تک ناقص۔ ایک پہلو وہ ہے جس سے ان کا دنیوی انٹرسٹ وابستہ ہو۔ اس معاملہ میں وہ آخری حد تک سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ پوری دقت نظر کے ساتھ معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ اتنے اکسپرٹ بن جاتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر ماہرانہ انداز میں گفتگو کر سکیں۔

اس کے بعد زندگی کے وہ دوسرے پہلو ہیں جن سے براہِ راست طور پر ان کا مادّی انٹرسٹ وابستہ نہیں۔ ان دوسرے موضوعات کو وہ ہمیشہ سرسری انداز میں لیتے ہیں۔ وہ ان کے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہی وجہ یہ کہ ان دوسرے موضوعات پر ان کے خیالات واضح نہیں ہوتے۔ ان دوسرے موضوعات پر ان کا دماغ کنفیوژن کا ایک جنگل ہوتا ہے۔ ان دوسرے موضوعات پر وہ یا تو طفلانہ باتیں کرتے ہیں یا ایسی الجھی ہوئی باتیں جس سے سننے والے کو کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ اس معاملہ کا مزید تباہ کن پہلو یہ ہے کہ یہ تعلیم یافتہ افراد اپنی مذکورہ روش کی بنا پر اپنے مخصوص فن کو بخوبی طور پر جانتے ہیں اور ان پر ماہرانہ انداز میں کلام کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر ان کے اندر ایک جھوٹا اعتماد (false sense of confidence) پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جھوٹے اعتماد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہوتی ہے جو دوسرے موضوعات کے معاملہ میں ان کی علمی اور فکری کمی کی تلافی کر سکے تو وہ اپنے فرضی اعتماد کی بنا پر اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دے پاتے۔ وہ اس کو ناقابلِ لحاظ سمجھ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کا یہ تباہ کن نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے اندر سیکھنے کا عمل رک جاتا ہے۔ وہ ایک قسم کے جہل مرکب کے مریض بن کر رہ جاتے ہیں۔

بوٹ کے اس سفر میں ہمارے ساتھ لوسرن کے ایک ریٹائرڈ جنرل بھی تھے جن کا نام جنرل سمرمان (Zimmarmann) تھا۔ بوٹ سے اترنے کے بعد جھیل کے ساحل پر ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور میں نے آپ کو پڑھا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ دنیا میں اپنے قسم کے ایک ہی انسان ہیں:

There is no one like you in the world.

اسی دن شام کو برگنسٹاک ہوٹل (Burgenstoc Hotel) میں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہاں بھی انہوں نے سب کے سامنے اس جملہ کو دہرایا۔ وہ آندرے بیکوف مشن سے جڑے ہوئے ہیں۔

۱۳ اکتوبر کی شام کو ایک ملاقات میں ڈاکٹر والٹر وِبَر (Walter Weber) نے کچھ سوالات مسلم سیاست کے بارے میں کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ کشمیر کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس

مسئلہ کا حل فطرت کے اس اصول میں ہے جس کو ایک مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ سیاست ممکن کا آرٹ ہے:

Politics is the art of the possible.

میں نے کہا کہ میں نے اس مسئلہ کا گہرا جائزہ لیا ہے اور ۱۹۶۸ سے میں ایک ہی بات کہتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ لائن آف ایکچول کنٹرول کو بین اقوامی سرحد مان کر معاملہ کو ختم کر دیا جائے۔ اس مسئلہ پر میں نے صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کو ایک خط (۹ جولائی ۲۰۰۱) بھیجا تھا۔

اُن کا دوسرا سوال یہ تھا کہ فلسطین میں تشدد کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں فلسطینیوں کے سامنے میں ایک تجویز بار بار پیش کرتا رہا ہوں اور وہی آپ کو بھی بتاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ پیغمبر اسلام کی پالیسی کے بارے میں ایک روایت صحیح البخاری میں آئی ہے۔ اُس میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام کو جب بھی دو طریقوں میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ مشکل انتخاب (harder option) کو چھوڑ دیتے اور آسان انتخاب (easier option) کو لے لیتے۔ اس حدیث کے مطابق، فلسطینیوں کو چاہئے کہ وہ پُر تشدد طریقِ کار کو چھوڑ دیں اور اپنی جدوجہد کے لیے پُر امن طریقِ کار کو اختیار کر لیں۔ اس کے بعد تشدد اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ آخر میں اُنہوں نے اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ اُنہیں چند انگریزی کتابیں دے دی گئیں۔

برگنسٹاک ہوٹل ایک پہاڑی کے اوپر واقع ہے۔ ہماری کار لمبا پہاڑی راستہ طے کر کے وہاں داخل ہوئی۔ انڈیا میں پہاڑی راستہ پر چلنا ایک مشکل سفر کے ہم معنٰی ہوتا ہے۔ مگر یہاں کی سڑکیں اور یہاں کی گاڑیاں اتنی معیاری ہیں کہ یہ پورا سفر نہایت آسانی کے ساتھ طے ہو گیا۔

برگنسٹاک ہوٹل بالکل نئے تصور کے مطابق بنایا گیا ہے۔ وہ ایک سبزہ زار کے درمیان واقع ہے۔ یہاں ۱۳ اکتوبر کی شام کو رات کا کھانا کھایا گیا۔ اس ہوٹل میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک جیکب وَن یوکس کُل (Jakobvon Uexkull) تھے۔ وہ ایک سینیئر جرنلسٹ ہیں۔ اور وہ سویڈن (Stockholm) کے رہنے والے ہیں۔ ان سے دیر تک تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے جدید

مغربی انسان کے بارے میں کہا کہ اس کا کیس معنویت کی تلاش (search for meaning) کا کیس ہے۔ وہ مادی تہذیب کے بارے میں اپنا یقین کھو چکا ہے۔ وہ ایک نئی چیز کی تلاش میں ہے۔ مگر وہ اب تک اسے نہ پاسکا۔

اس گفتگو کے دوران امریکی مصنف ہنٹنگٹن کی کتاب کلیش آف سویلائزیشنز (Clash of Civilizations) کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ اس کتاب میں اسلام کی غلط نمائندگی کی گئی ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کی قومی کوشش کو اسلامی جہاد کے ہم معنٰی سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی موجودہ قومی کوشش کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد میں نے انہیں اسلام کی حقیقی تعلیمات سے متعارف کرایا۔

برگنسٹاک ہوٹل میں الفرڈو یونس (Alfredo Sfeir Younis) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک جرمن ہیں اور اب وہ جنیوا میں رہتے ہیں۔ وہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے اپنا جو کارڈ دیا اس پر ان کی بابت یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Special representative to the United Nations and the World Trade Organization, The World Bank Geneva.

الفرڈ یونس سے اسلام پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس کی شکل یہ تھی کہ پہلے میں نے بار بار سوال کر کے ان کے اپنے شعبوں سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ آپ تو صرف مجھ سے پوچھ رہے ہیں، خود کچھ نہیں بتاتے۔ اس طرح گفتگو کا موضوع اسلام بن گیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ پڑھا ہے مگر اسلام کے بارے میں میری معلومات بہت کم ہیں۔ اس کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ انہیں اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ وہ نہایت غور کے ساتھ میری باتیں سنتے رہے۔

۱۴ اکتوبر کی صبح کو مسٹر آندرے بیکوف سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس ملاقات کا انتظام اُنہوں نے پارک ہوٹل میں کرایا تھا۔ اس گفتگو میں مذہب اور روحانیت اور امن عالم جیسے سوالات پر مفصل تبادلۂ

خیال ہوا۔ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ خود بھی گہری باتیں کرتے ہیں اور دوسرے کی بات کو گہرائی کے ساتھ سمجھتے ہیں۔ وہ میری باتوں کو اپنے جیبی کمپیوٹر پر نوٹ کرتے رہے۔ اُنہوں نے ایک خاص بات یہ کہی کہ یروشلم کے ایک چرچ میں سال کے ایک دن ایک خاص تاریخ اور ایک خاص وقت میں آسمان سے روشنی آتی ہے۔ وہ چرچ کی چھت سے داخل ہوکر آتی ہے اور پورے ماحول کو روشن کردیتی ہے۔ آندرے بیکوف نے بتایا کہ وہ اس مقدس روشنی کو دیکھنے کے لیے ہر سال یروشلم جاتے ہیں۔ حتی کہ انہوں نے اس کی ویڈیو فلم بھی بنائی ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ روشنی مسیح کی طرف سے آتی ہے۔ میری واپسی کے بعد اُنہوں نے ماسکو سے ٹیلی فون کرکے بتایا کہ اس سال یہ روشنی ایسٹر کے دن ۲۷ اپریل ۲۰۰۳ کو ظاہر ہوگی۔

اس قسم کے طلسماتی عقیدے ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ لوگ ان کا تجزیہ نہیں کرتے اس لیے ان کے بارے میں ان کے یقین میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مثلاً مذکورہ مسیحی روشنی پر غور کرتے ہوئے اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ مسیح کے بعد چرچ نے ان کے اصل مذہب کو بدل ڈالا۔ پھر مسیح نے اصل مسیحیت کو انسان کے سامنے دوبارہ واضح کیوں نہیں کیا۔ حتیٰ کہ جس چرچ نے ان کے مذہب کو بدلا تھا اسی چرچ میں ہر سال مقدس روشنی بھیج کر وہ اس کو مستند بنانے (authentication) کا کام کررہے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ روشنی، خواہ وہ جو بھی ہو، مگر وہ مسیحی روشنی ہرگز نہیں ہوسکتی۔

یہاں معلوم ہوا کہ سوئزرلینڈ میں ایک قانون کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ یہاں کے ۹۵ فیصد سے زیادہ گھروں میں ایٹمک بنکر (Bunker) موجود ہیں۔ وہ اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ اگر کبھی ایٹمی حملہ ہو تو لوگ ان بنکروں میں پناہ لے کر اپنے آپ کو اُس کی زد سے بچا سکیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ سوئزرلینڈ میں عام طور پر خدا لوگوں کا کنسرن نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو ہر چیز خدا کے بغیر ملی ہوئی ہے، پھر ہمیں خدا کی کیا ضرورت۔ شیطان نے یہ کیسا عجیب مغالطہ لوگوں کے دماغوں میں ڈال دیا ہے۔ سوئزرلینڈ کے لوگوں کو جھیل سے لے کر موٹر کار تک جو کچھ ملا ہوا ہے وہ سب مکمل طور پر خدا کا عطیہ ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے ذریعہ ہی انہوں نے اپنی موجودہ پرراحت زندگی کی

تعمیر کی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ نعمت کو لے رہے ہیں مگر وہ منعم کا اعتراف نہیں کرتے۔

یہاں کویت کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام علی حسن ہے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ عربوں میں آج کل جو اسلام ہے وہ بڑا عجیب ہے۔ مثلاً اگر آپ ایک عرب سے پوچھیں کہ آج موسم کیسا ہے تو وہ ہر بات میں بار بار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ اور سبحان اللہ بولے گا اور پھر جواب دے گا۔ یہ ان کا تکیہ کلام ہے، وہ کسی اسلامی اسپرٹ کا اظہار نہیں۔ میں نے کہا کہ آج کل مسلمانوں میں جو اسلام ہے وہ دین کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ ایک کلچر کے طور پر ہے، جیسا کہ دوسروں میں ہے۔ آج کل ہر مذہبی گروہ میں بظاہر مذہبی سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ کلچرل سرگرمیاں ہیں، نہ کہ دینی سرگرمیاں۔

۱۴ اکتوبر کی شام کو ایک مجلس میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس مجلس میں آندرے بیکوف اور پرنس الزبتھ کے ساتھ دوسرے کئی لوگ موجود تھے۔ میرے ایک ہندستانی ساتھی نے بعد کو بتایا کہ آپ ڈھائی گھنٹہ تک مسلسل انگریزی میں بولتے رہے اور میں حیرانی سے سن رہا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب نعمت ہے کہ آپ ایک مولوی ہوتے ہوئے اتنے وضوح کے ساتھ انگریزی دانوں کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کلام کر رہے ہیں۔

اس گفتگو میں دوسری باتوں کے ساتھ میں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ ''ٹررزم'' کے خلاف بعض مغربی ملک جو فوجی کارروائیاں کر رہے ہیں اس سے ٹررزم ختم ہونے والا نہیں۔ موجودہ ٹررزم گن ورسز گن کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ گن ورسز آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے۔ لوگوں کو جاننا چاہئے کہ کچھ نام نہاد ٹررسٹ لیڈروں کو ہلاک کر کے یا ٹررسٹ مراکز کے نام پر کچھ بلڈگوں کو تباہ کر کے ٹررزم کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اپنے ٹررزم کے جواز کے لیے ایک ایسا نظریہ دریافت کر لیا ہے جس پر انہیں کامل یقین ہے۔ حتی کہ خودکش بمباری کو وہ شہادت سمجھتے ہیں۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس جنگ میں اگر وہ مارے گئے تو وہ سیدھے جنت میں جائیں گے۔ آپ فوجی طاقت کے ذریعہ کسی کے جسم کو مار سکتے ہیں مگر فوجی طاقت کے ذریعہ اسپرٹ کو مارا نہیں جاسکتا۔

They even believe that suicide bombing is the surest entry visa for eternal paradise. Military power can kill the body not the spirit.

میں نے کہا کہ اگر آپ دنیا سے تمام ایٹم بموں کو ختم کر دیں تب بھی ٹررزم ختم نہ ہوگا۔ کیوں کہ ٹررزم مائنڈ میں ہے، نہ کہ ہتھیار کے ذخیروں میں۔ آپ کو اپنے موجودہ پروگرام کے ساتھ ایک نظریاتی جدوجہد شروع کرنی ہوگی:

Alongwith the present nuclear disarmament programme you have to launch an ideological campaign to replace militant thinking with peaceful thinking.

۱۴ اکتوبر کی شام کی یہ مجلس غالباً میرے اس پورے سفر کی سب سے اہم مجلس تھی۔ اس مجلس میں ایک ممتاز مغربی شخص بھی شریک تھے جو لاس اینجلس میں رہتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ واشنگٹن کی امریکی انتظامیہ (Administration) سے اُن کے براہِ راست تعلقات ہیں۔ مجلس میں اُن کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے فلسطین کے تحت عرب۔ اسرائیل مسئلہ کا ذکر کیا۔

میں نے کہا کہ میرے اندازے کے مطابق، امریکی ذمہ دار فلسطین کے مسئلہ کی گہرائی کو ابھی تک سمجھ نہیں سکے ہیں۔ اس لیے بے شمار طاقت خرچ کرنے کے باوجود وہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ امریکی لوگ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر اُنہیں صحیح بات پہنچائی جائے تو وہ ضرور اُس پر غور کریں گے۔

میں نے کہا کہ آپ امریکی ذمہ داروں کو بتائیے کہ صرف فوجی طاقت کے ذریعہ مغربی ایشیا میں امن کا قیام ممکن نہیں۔ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ امریکا مغربی ایشیا میں اپنی پالیسی کو بدلے۔ اب تک وہ یک طرفہ طور پر پرو اسرائیل پالیسی پر قائم رہا ہے۔ اب وہ اپنی اس پالیسی کو بدل کر اس معاملہ میں اس حکیمانہ فارمولے کو اختیار کرے جس کو میں بھی جیتا تم بھی جیتے (win-win formula) کہا جاتا ہے۔ مثلاً یروشلم کے معاملہ میں وہ اسرائیل کو ایک شہر دو انتظامیہ (one city, two administration) کے اصول پر راضی کرے۔ اس کے بغیر امن کا قیام ممکن نہیں۔ اس اصول کے تحت یروشلم کے مشرقی حصہ کو عربوں کے حوالہ کر دیا جائے اور یروشلم کا مغربی حصہ اسرائیل کے قبضہ میں رہے۔

۱۴ اکتوبر کی شام کو ڈنر پر پرنس ایلزبتھ سے گفتگو ہوئی۔ اُن کی زندگی میں کئی حادثے پیش آئے۔ بادشاہت ختم ہوگئی۔ شوہر سے طلاق ہوگیا۔ معاشی سہولتیں کم ہوگئیں۔ ان محرومیوں کے بعد وہ سکون کی تلاش میں نکلیں۔ اُن کی ملاقات ایک گرومائی سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ یوگا اور میڈیٹیشن میں سکون تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ برسوں سے روزانہ میڈیٹیشن (meditation) کرتی ہیں۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ میڈیٹیشن کیا ہے۔ کیا وہ کوئی ذہنی عمل (intellectual process) ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر وہ کیا ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ وہ ذہن کو سکون دیتا ہے: It is quietening of the mind.

میں نے کہا کہ میں ایک روحانیت پسند آدمی ہوں اور میں بھی میڈیٹیشن کا عمل کرتا ہوں۔ مگر میرا میڈیٹیشن ذہنی عمل کے ذریعہ ہوتا ہے، نہ کہ ذہنی عمل کو بند کرکے یا اس کو سپریس (Supress) کرکے۔

موجودہ صنعتی دور کے مسائل میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جس کو ذہنی تناؤ (mental tension) کہا جاتا ہے۔ اس صورت حال نے قدیم میڈیٹیشن کے طریقہ کو ایک نئی زندگی دے دی ہے۔ مغربی ملکوں میں مسلم صوفی اور ہندو سوامی کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر ذہنی عمل کو سپرس کرنے کا یہ طریقہ ایک قسم کی ذہنی تخدیر (intellectual aneaesthesia) ہے۔ انسان کی فطرت کے اعتبار سے اس کے لئے صحیح طریقہ ذہنی بیداری ہوسکتا ہے، نہ کہ ذہنی تعطل۔

پروفیسر محمود مراد ایک مصری اسکالر ہیں۔ وہ جنیوا میں رہتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوا کہ میں زُگ میں ہوں اور یہاں کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ ۱۴ اکتوبر کی شام کو ان کا ٹیلی فون آیا۔ دیر تک ان سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔

پروفیسر مراد نے کہا کہ میں نے انگریزی اور عربی میں آپ کی کافی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں آپ سے پوری طرح اتفاق رکھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی مسلم دنیا میں آپ جیسا اسلامی اسکالر مجھے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے وطن مصر گیا تھا۔ وہاں سڑک کا ایک حادثہ پیش آگیا۔ آج کل میں زیر علاج ہوں اور سفر کرنے سے معذور ہوں ورنہ میں زُگ آتا اور آپ سے

براہِ راست ملاقات کرتا۔ وہ کسی قدر دشواری کے ساتھ انگریزی بول رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ عربی میں بولیے۔ وہ اس کو سن کر خوش ہو گئے اور پھر بقیہ گفتگو عربی زبان میں ہوئی۔

انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک کتاب عربی زبان میں شائع کی ہے جس پر الازہر کے علماء غصہ ہیں۔ اس میں محمد ابن اسحاق (وفات ۱۵۱ھ) پر تنقید کی گئی ہے۔ تنقید کا ایک جزء یہ ہے کہ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ مکی دور میں رسول اللہ ﷺ مشرکین کی حمایت میں رہے۔ حتیٰ کہ ابوطالب کی وفات کے بعد وہ نئے حامی کی تلاش میں طائف گئے۔ پروفیسر مراد کے نزدیک یہ بات بہت زیادہ غلط ہے۔ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ خدا کی اور مسلم مجاہدین کی حمایت میں تھے، نہ کہ کسی کافر یا مشرک کی حمایت میں۔

یہ نقطۂ نظر میرے نزدیک غیر تاریخی بھی ہے اور غیر تاریخی بھی ہے اور غیر قرآنی بھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کا زمانہ قبائلی نظام کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں کوئی شخص قبائل کی حمایت ہی میں محفوظ رہ سکتا تھا چنانچہ دوسرے پیغمبروں کی طرح خود پیغمبر اسلام بھی دور فتح سے پہلے قبیلہ کی حمایت (مَنعت) میں رہے۔ یہ بات حدیث سے صراحۃً ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو مسند احمد الجزء ۲ صفحہ ۵۳۳)۔

اگر قرآنی اعتبار سے اس معاملہ کو دیکھیں تو قرآن بتاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عام انسانوں کے لیے ایک نمونہ (اسوہ) تھے۔ کوئی شخص نمونہ اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ وہ فوق الانسان نہ ہو بلکہ وہ عام انسانوں ہی کی مانند ہو۔ ورنہ وہ عام انسانوں کے لیے نمونہ (اسوہ) نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے انسان کے لیے نمونہ نہیں ہیں بلکہ پیغمبر انسان کے لیے نمونہ ہیں۔ اس بنا پر قرآن میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ پیغمبر تمہاری طرح ایک بشر ہے (ما انا الا بشر مثلکم)

سوئزرلینڈ کے ایک مسیحی نوجوان جو پروڈکشن انجینئر کے طالب علم ہیں، ان کی عمر ۲۴ سال ہے۔ وہ ہابی کے طور پر فوٹو گرافی کرتے ہیں۔ پریا ملک نے بتایا کہ انہوں نے ان سے ایک سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ مسیحی مذہب میں موت کے بعد دوسری دنیا کا تصور موجود ہے، پھر کیا آپ اس کے بارے میں نہیں سوچتے کہ موت کے بعد آپ کے ساتھ کیا پیش آئے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اس معاملہ میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ یسوع مسیح نے ہمارے گناہوں کو اپنے اوپر لے لیا ہے اس

لیے ہماری جنت تو یقینی ہے۔ پھر ہمیں اس کی فکر کی کیا ضرورت:

Jesus Christ has taken all our sin. So Paradise is assured for all of us. Why should we worry about it.

سوئزرلینڈ کی اس کانفرنس کے موقع پر دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ تقریباً چار سو کی تعداد میں اکٹھا ہوئے تھے۔ راقم الحروف کی انگریزی کتابیں اُن میں سے اکثر افراد تک پہنچائی گئیں۔ میرا ایک انگریزی پمفلٹ مینی فیسٹو آف پیس (Manifesto of Peace) کے نام سے ہے۔ اس کی فوٹو کاپیاں کانفرنس کے ذمہ داروں کی طرف سے تیار کرائی گئیں اور اُن کو بڑی تعداد میں لوگوں کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ کانفرنس کے ذمہ داروں کی طرف سے بڑے سائز کی ایک نہایت خوبصورت اور مجلّد کتاب آرٹ پیپر پر چھپوائی گئی تھی۔ یہ کتاب ۲۵۶ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کتاب میں امن سے متعلق میری تین تقریریں شامل کی گئی تھیں۔

۱۵ اکتوبر ۳ بجے شام کو ہم لوگ زُگ میں واقع نیوکلیر ڈس آرمامنٹ فورم کے آفس میں لے جائے گئے۔ وہاں مختلف چیزیں دیکھیں۔ ایک دلچسپ چیز یہ تھی کہ مسٹر آندرے بیکوف نے ایک ویڈیو ٹیپ دکھایا جو اُن کے چھوٹے کمپیوٹر پر ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ یوروشلم کے ایک قدیم چرچ میں ہر سال اُس کی چھت کی طرف سے ایک تیز روشنی آتی ہے۔ یہ روشنی چند منٹ تک باقی رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہر سال ایسٹر کے موقع پر پیش آتا ہے۔ آندرے بیکوف اس روشنی کو دیکھنے کے لیے یروشلم گئے۔ وہاں اُنہوں نے اس معاملہ کا پورا ویڈیو تیار کیا۔ اس کو اُنہوں نے کمپیوٹر کھول کر ہمیں دکھایا۔ یہ پورا ویڈیو چھ منٹ کا تھا۔ اس میں روشنی ایک آبشار کی مانند ظاہر ہوئی۔ اُس نے کسی کو جلایا نہیں اور پھر کچھ دیر کے بعد اپنے آپ ختم ہوگئی۔

سفر سے واپسی کے بعد سوئزرلینڈ سے مختلف تاثراتی خطوط موصول ہوئے۔ اُن میں سے ایک مزعند لیب حیات کا تھا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک ہندستان ٹائمس کے نمائندہ مسٹر خالد انصاری تھے۔ اُنہوں نے ہماری کچھ انگریزی کتابیں سوئزرلینڈ میں مزعند لیب حیات کو دی تھیں۔ واپسی کے بعد اُن کی طرف سے مسٹر خالد انصاری کو ای میل مورخہ ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۲ اور ۲ نومبر ۲۰۰۲ ملا۔ اس خط میں اُنہوں نے مذکورہ لٹریچر کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

Dear Khalid

Thanks for your email- I am glad you got back ok last week and enjoyed your stay in Switzerland. Please thank Maulana for the books he left—they will keep me busy over the winter!

Before reading "Ideology of Peace" I thought it will be just like any other book but the Islamic concept of peace and the wisdom presented by Maulana saheb, really amazed me. I am sure that this Islamic perspective and prophetic wisdom will definitely help people avoid conflicts and live in harmony.

I am very sorry but when you sent the mail, my mailbox was full and didn't keep any copies of mails sent. Subsequently, this means that I don't have a copy of your text - I thought I had printed it out too and gave it to you? Do you remember that?

I am sorry but there isn't any thing I can do.

If I can help you in any way, please let me know.

Kind regards,
Andleeb Hayat

Nuclear Disarmament Forum AG
Zug/Switzerland

Dear Khalid

Thanks for your email- I am glad you got back ok last week and enjoyed your stay in Switzerland.

I have not been able to read all the literature you left behind but I want to share my excitement with you which has helped me undersatnd Islam in a better way. Islam which has been presented by Maulana appears to be practically more logical, nature- friendly and convincing .Please thank Maulana for the books he left—they will keep me busy over the winter!

If I can help you in any way please let me know.

Kind regards,
Andaleeb Hayat

Nuclear Disarmament Forum AG, Zug/Switzerland

۱۱۶ اکتوبر ۲۰۰۲ کو سوئزرلینڈ سے دہلی کے لیے واپسی تھی۔ صبح ۱۰ بجے ہوٹل کو الوداع کہہ کر زُگ سے زیورک کے لیے بذریعۂ کار روانہ ہوا۔ حسب معمول پورا سفر ہموار سڑک اور دو طرفہ سبزہ کے درمیان طے ہوا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد ہم زیورک کے ایرپورٹ پر پہنچے۔ ضروری کارروائی کے بعد ہم سوئس ایر کی فلائٹ نمبر ۱۷۲ میں داخل ہوئے۔ زیورک سے اس جہاز کی روانگی کا وقت ۱۲ بجے تھا۔

واپسی کا یہ سفر زیادہ ہموار نہ تھا۔ درمیان میں جہاز تیزی سے ہلنے لگا اور نیچے اوپر ہونے لگا۔ جہاز میں یہ معاملہ ہواؤں کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ سفر خواہ بحری جہاز سے ہو یا ہوائی جہاز سے، دونوں حالتوں میں سفر کا ہموار یا غیر ہموار ہونا تمام تر ہواؤں پر منحصر ہوتا ہے اور ہواؤں پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ حتیٰ کہ وہ پوری طرح قابلِ پیشین گوئی بھی نہیں۔ راستہ میں مشہور انگریزی اخبار ہیرالڈ انٹرنیشنل ٹریبون (Herald International Tribune) کا شمارہ ۱۱۶ اکتوبر ۲۰۰۲ دیکھا۔ یہ انگریزی اخبار کئی ملکوں سمیت سوئزرلینڈ سے بھی چھپتا ہے۔ اس کے صفحۂ اول پر ایک خبر تھی جس کا عنوان یہ تھا:

Al Qaeda shifting to small-scale operations.

واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپی ہوئی اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ حال میں مغربی لوگوں کے خلاف کی ہوئی خودکش بمباری سے ظاہر ہوتا ہے کہ القاعدہ کے کارکن اپنے کمزور شدہ قائدین کی ہدایت پر دہشت گردی کی ایک نئی مہم شروع کر رہے ہیں۔ وہ نسبتاً چھوٹے ہتھیاروں سے حملہ کر رہے ہیں اور اقتصادیات کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ اب القاعدہ غیر مسلح لوگوں پر حملہ کو اپنا نشانہ بنا رہی ہے:

Al-Qaeda is resorting to more indiscriminate attacks against "soft" targets.

جہاز میں نئی دہلی کا انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (۱۱۶ اکتوبر ۲۰۰۲) بھی مطالعہ کے لیے موجود تھا۔ اُس کے ادارتی صفحہ پر حسبِ معمول ایک قول درج تھا۔ یہ قول ہندستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کا تھا۔ اُس میں کہا گیا تھا کہ مسئلہ یہ ہے کہ مغربی ممالک اپنے خلاف دہشت گردی کو زیادہ جانتے ہیں۔ اور ہمارے یہاں کی دہشت گردی کو وہ زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے:

The problem is western countries see their own terrorism better and do not see our terrorism as quite so serious. (p. 12)

میرے نزدیک یہ شکایت بالکل بے جا ہے۔ ہندستان سمیت ہر ملک یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے مسائل کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور دوسروں کے مسائل کو کم۔ ایسی حالت میں یہ ایں گناہ است کہ درشہر شما نیز کنند کا معاملہ ہے۔ پھر اس پر کسی ایک کو دوسرے سے شکایت کرنے کا کیا حق ہے۔

جہاز دہلی ایر پورٹ پر اُترا تو مقامی وقت کے لحاظ سے رات کے ایک بج چکے تھے۔ سفر کے دوران دوبارہ کیلنڈر بدل چکا تھا۔ زیورک میں جب ہوائی جہاز پر میں نے اپنا سفر شروع کیا تو اُس وقت وہاں کے اعتبار سے ۱۶ اکتوبر کی تاریخ تھی اور جب میں دہلی ایر پورٹ پر پہنچا تو اکتوبر کی ۱۷ تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ یہ سب ساڑھے سات گھنٹہ میں ہوا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ سوئزر لینڈ اور دہلی کے وقت میں ساڑھے تین گھنٹہ کا فرق پایا جاتا ہے۔

Spiritual Message

ماہنامہ الرسالہ کا ہندی ایڈیشن الرسالہ کے نام سے بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ اب خدا کے فضل سے ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بھی بمبئی سے شائع ہونے لگا ہے۔ اس کا نام بدل کر اسپر یچول میسیج (Spiritual Message) رکھا گیا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ جون ۲۰۰۳ کو شائع ہو چکا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی عمومی اشاعت کے لیے اسپر یچول میسیج بہت مفید ہے۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر انگریزی خواں طبقہ میں اس کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایجنسی لے کر بھی اور اس کے خریدار بنا کر بھی۔ اسی طرح لائبریریوں اور اداروں میں بھی ان کو پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اسپر یچول میسیج کی قیمت فی شمارہ -/15، سالانہ -/165 روپے، بیرونی ملکوں کے لیے ۱۲ ڈالر یا ۷ پونڈ ہے۔ اس کا پتہ یہ ہے:

Mr. Haroon B. Shaikh
302 Koldongri, CHS, Sahar Road, Andheri (East) Mumbai-400 099
Te. 2834 1654/2834 6079/2821 8609
Fax: 2823 6323, E-mail: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in